ترجمہ و تفسیر

مولانا ابوالکلام آزاد

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ؟

کیا مُسلمانوں کیلئے ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کے ذکر اور اس کے کلمہ حق کیلئے ان کے اندر درد اور شکستگی پیدا ہو اور وہ اپنے پروردگار کے آگے جھک جائیں؟

قرآن حکیم کی تین سورتیں

(ترجمہ و تفسیر)

جامعہ بیت العتیق (رجسٹرڈ)
کتاب نمبر ______________

مولانا ابوالکلام آزاد

مکتبۂ جمال
تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 7232731 Mob: 0300-8834610
Email: maktabajamal@yahoo.co.uk
maktaba_ jamal@email.com

نام کتاب: .... قرآن حکیم کی تین سورتیں (ترجمہ و تفسیر)

مصنف .... مولانا ابوالکلام آزاد

ناشر: .... مکتبہ جمال ٥ لاہور

اہتمام: .... میاں غلام مرتضےٰ کھٹانہ

مطبع: .... تایا سنز پرنٹرز ٥ لاہور

سن اشاعت: 2008ء

قیمت: .... 70 روپے

ملنے کا پتہ:

تیسری منزل حسن مارکیٹ اردو بازار لاہور
فون: 7232731 Mob: 0300-8834610
Email: maktabajamal@yahoo.co.uk
maktaba_ jamal@email.com

اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی حقیقی شکل ونوعیت میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی مؤثرات نے اس کے چہرے پر ڈال دیئے ہیں، پھر آگے بڑھیں اور قرآن کی حقیقت خود قرآن ہی کے صفحوں میں تلاش کریں۔

ترجمان القرآن جلد اول (تیسرا ایڈیشن)

فہرست

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ○ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ○ وَهٰذَا الْبَلَدِ
الْاَمِيْنِ ○ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ
○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ
○ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ○ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَ
حْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ○

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر سورۂ والتین سے پہلے اسی سورہ کی تفسیر از مولانا مظہر الدین صاحب شیرکوٹی آپ کے مطالعہ میں آئے گی۔ پہلی تفسیر البلاغ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۵ء میں مولانا مظہر الدین صاحب کے قلم سے شائع ہوئی۔ اس پر مولوی وصی احمد صاحب بلگرامی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں چند ضروری استفسارات پیش کیے جن کے جواب میں مولانا نے تفسیر سورۂ والتین لکھی جو البلاغ (۲۵ فروری اور ۳ مارچ ۱۹۱۶ء) میں شائع ہوئی

انسان جب غور و فکر کی آنکھیں کھولتا ہے تو دیکھتا ہے کہ نیچے زمین ہے اور سر پر آسمان ہے۔ ان کی وسعت اس کے خیال سے بالاتر اور ان کی قدامت اس کے ادراک سے باہر ہے۔ ایک طرف وہ عظیم الشان پہاڑوں میں گھرا ہے جن کی چوٹیاں نامعلوم بلندیوں تک مرتفع ہیں، دوسری طرف بلاخیز سمندر کی لہریں اس کے اردگرد طوفان خیز ہیں جن کے سامنے انسان کی ہستی تو کیا اس کی زمین بھی کائی کی طرح چھٹ جاتی ہے۔ ان عظیم ترین ہستیوں سے قطع نظر کر کے جب وہ چھوٹے چھوٹے جسموں کی قوت پر توجہ کرتا ہے تو اور زیادہ متعجب ہوتا ہے کہ ہستی و حیات کے یہ حقیر ذرات طاقت و عمل کیسی حیرت انگیز مثالیں اپنے اندر رکھتے ہیں!!

وہ ڈسنے والے سانپوں کی برق رفتاری پر خیال کرتا ہے۔ خونخوار جانوروں کی طاقت کو دیکھتا ہے۔ ابر کے ایک معمولی ٹکڑے سے بڑے بڑے شہروں کا زیر و زبر ہونا اس کے سامنے آتا ہے۔ پھونک سے اُڑ جانے والی چنگاری کی قوت اس کے پیش نظر ہوتی ہے اور جب ان تمام مناظر قدرت کو اپنے سامنے لاتا ہے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ اے ہستیٔ انسانی! تو کیا ہے؟ تیری حقیقت کچھ بھی نہیں۔۔۔ بحر وجود میں پانی کا ایک بلبلہ، عالم خلق میں ہوا کا ایک جھونکا، میدان تکوین میں مجموعۂ غبار کا ایک نقش پا۔۔۔!!!

لیکن سورۂ مبارکہ ''والتین'' میں قرآن حکیم نے اس خیال کی تردید کی ہے اور شرف انسانی کے دلائل بینہ پیش کیے ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ عالم وجود کی دوسری چیزوں کے ساتھ انسان کو کیا نسبت ہے؟ بلاشبہ انسان پانی کا بلبلہ ہے، مگر کون سا پانی؟ وہ جو آبِ بقاء کا

ایک سرچشمہ ہے۔ کچھ شک نہیں کہ انسان ہوا کا ایک جھونکا ہے، مگر کس ہوا کا؟ وہ جو باغ وحدت کی ایک لہر ہے۔ ہاں یقیناً انسان کا وجود ایک نقش پا ہے، مگر کیسا نقش پا؟ وہ جو وجود بحت کا سب سے زیادہ مکمل نشان ہے۔ خلاصہ یہ کہ سریر ظہور کا تاجدار اور منصۂ شہود کی رونق وجود انسانی ہی ہے۔

انسان کا اشرف خلائق ہونا ایک ایسا بین دعویٰ ہے جس کے لیے احتیاج دلیل نہ تھی۔ لیکن اپنی ہستی سے خود فراموشی ہی کبھی کبھی مانع کار ہو جاتی ہے اور اکثر دنیا کے بڑے بڑے اعمال صرف اسی لیے ناتمام رہ جاتے ہیں کہ ان کے کرنے والے اپنے آپ کو نہایت ضعیف وناتواں سمجھ کر ہمت ہار دیتے ہیں۔ لہٰذا ایک ایسے ناموس الٰہی کے لیے جو "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" (۱۶ : ۸۹) اور "نور مبین" کی حیثیت رکھتا ہو، ضرور تھا کہ انسانی فضلیت کی کامل حقیقت کو اس کے سامنے صاف صاف پیش کر دے۔

علاوہ ازیں یہ دین حنیف کے اس اہم ترین رُکن کی ایک تمہید اور مقدمہ بھی تھا، جسے میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح میں "قانون مجازات" کے لقب سے تعبیر کروں گا۔

پس اس سورۃ کے مضمون کی تقسیم دو قسموں میں ہو سکتی ہے:

۱۔ شرف انسانی کا ثبوت

۲۔ قانون مجازات

مبحث اوّل

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ o وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ o وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ o لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ o

انجیر، زیتون، طور سینا، مکہ معظّمہ، اس دعویٰ پر شاہد ہیں کہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر حالت میں پیدا کیا ہے۔

''تقویم'' کی تفسیر میں قاضی بیضاوی تحریر فرماتے ہیں:

تعديل بان خص بانتصاب القامة وحسن صورة و استجماع خواص الكائنات و نظائر سائر الممكنات (انتهیٰ)

تقویم کے معنی تعدیل کے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان سرو قامتی، حسن صورت اور کائنات کے تمام خواص اور تمام ممکنات کی تمثیلات کا مجموعہ ہے۔

اسی مضمون کو امام رازی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

التقويم تصيير الشئی علی ما ينبغی ان يكون فی التاليف و التعديل يقال قومته تقويما فاستقام و تقوم (انتهیٰ)

تقویم کے معنی ہیں کسی شے کا ایسی حالت میں پیدا کرنا جس کے لائق وہ اپنی تالیف و تعدیل میں تھی۔ ایسے موقع پر جب کوئی شے چند چیزوں سے ترتیب دے کر بنائی گئی ہو اور وہ درست ہو، تو اہل عرب کہا کرتے ہیں:

قومته تقويما فاستقام و تقوم

محدث ابن جریر طبری اپنی شہرہ آفاق تفسیر میں "تقویم" کے مختلف معنی نقل کرتے ہوئے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں:

واولی الاقوال فی ذٰلك بالصواب ان یقال ان معنی ذٰلك فی احسن صورة و اعدلها (انتہیٰ)

تقویم کے معنی میں بہترین قول یہ ہے کہ اس کے معنی احسن واعدل حالت کے ہیں۔

یہ تینوں مفسر اور ان کے سوا اور مفسرین بھی اگرچہ ترتیب الفاظ تعبیر مقصد میں مختلف ہیں، تاہم منشاء ومآل سب کا ایک ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بیضاوی نے نہایت مفصل اور جامع الفاظ میں "تقویم" کا مفہوم ادا کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "کیا بلحاظ حسن صورت اور کیا بلحاظ بلندی قامت انسان تمام ممکنات کی تمثیل اور کل کائنات کے خواص کا مجموعہ ہے" اور یہ انسانی شرف کی بہت بڑی دلیل ہے کہ جو اوصاف (مثلاً حیوانات میں حرکت اور ارادہ و انتقام، نباتات میں نشوونما، ملائکہ میں طاعت رب کریم وغیرہ وغیرہ) فرداً فرداً دیگر مخلوقات میں موجود ہیں، وہ سب کے سب ایک وجود انسانی میں مکنون ہیں:

فلینظر الناظرون ویمحص المشتاقون

اسی مضمون کو قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا ہے۔ صرف اجمال وتفصیل کا فرق ہے ورنہ مقصود ایک ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۶۴:۴۰)

اے انسانو! خدا نے تم کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

یہاں صورت سے مراد صرف نقش ونگار جسمانی یا خدوخال نہیں، بلکہ صور معقولہ وقوائے ادراکیہ بھی ہیں۔

(کما صرح به الاصفهانی فی الذریعه و المفسرون فی تفسیر هم)

دوسری جگہ جو بہت زیادہ مفصل ہے، اس طور پر مذکور ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (۷۰:۱۷)

ہم نے نبی آدم کو بزرگی عطا فرمائی اور تری و خشکی میں ان کے چلنے کے لیے سواریاں بنائیں۔ عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو دیں۔ یہاں تک کہ مخلوقات کے اکثر حصہ پر ان کو فضیلت و سیادت حاصل ہے۔

ان تمام آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقصود فضیلت انسانی کا ثبوت ہے۔ سورہ والتین میں اس دعویٰ کو مدلل و مشرح کیا گیا ہے اور ثبوت میں چار دلیلیں بصورت قسم پیش کی گئی ہیں۔

محققین نے محاورات عرب و اشعار جاہلیت سے اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ قسم اپنے مابعد بیان کے لیے شہادت و دلیل ہوتی ہے۔ امام رازی سورۂ ذاریات کی تفسیر لکھتے ہوئے شروع ہی میں تحریر فرماتے ہیں

ان الایمان اللتی حلف الله تعالیٰ بها کلها دلائل اخرجها فی صورة الایمان مثاله قول القائل لمنعمه وحق نعمك الکثیره، انی لاازال اشکرك۔ فیذکر النعم وهی سبب مفید لدوام الشکر

تمام وہ قسمیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمائی ہیں، سب کی سب قسم کی صورتوں میں دلائل ہیں۔ جس طرح کوئی اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کہتا ہے: وحق نعمتك الکثیره انی لا ازال اشرك اور اس قول میں نعمتوں کا ذکر دوام شکر کے لیے سبب قرار دیتا ہے۔

اس مسئلہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ پر یہ چار قسمیں " تِيْنَ ، زَيْتُوْنِ ، طُوْرِ سِيْنِيْنَ ، بَلَدِاَمِيْنِ " کیونکر دلیل ہوسکتی ہیں؟

تین وزیتون کی شہادت

"تیــن" کے معنی بعض مفسرین نے دمشق کے ایک پہاڑ اور بعض نے بیت المقدس کے ایک پہاڑی مقام کے بیان کئے ہیں لیکن یہ سب اقوال مرجوح ہیں اور ان کے ضعف کی طرف بیضاوی وغیرہ مفسرین نے اشارہ بھی کیا ہے۔ مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اس کے معنی اسی پھل کے لیے جائیں جس کو ہم اپنی زبان میں "انجیر" کہتے ہیں۔ اس طرح زیتون سے بھی مراد وہی مشہور پھل ہے جس سے روغن نکالا جاتا ہے اور جو اہل عرب کی ہر دلعزیز و جان پرور غذا ہے۔

ابن جریر لکھتے ہیں:

عن الحسن فی قول الله والتین والزیتون قال تینکم هذا الذی یوکل وزیتونکم هذا الذی یعصر (حدثنا ابن بشار)

حضرت حسنؒ سے مروی ہے کہ قرآن شریف میں "تین" سے مراد وہی پھل ہے جسے لوگ کھاتے ہیں اور زیتون سے مراد وہی ہے جس سے روغن نکالتے ہیں۔

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں تین زیتون کے معنی بیان کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں:

هو تینکم و زیتونکم هذا۔

اے اہل عرب! تین وزیتون سے مراد یہی تمہارے مشہور پھل ہیں۔

ان دونوں الفاظ کے معنی متعین ہونے کے بعد غور کرو کہ یہ شرف انسانی پر کس طرح شاہد ہیں؟ تم جانتے ہو کہ انجیر ایک نہایت چھوٹا سا پھل ہے، لیکن

غذا و دوا میں بے شمار فوائد رکھتا ہے۔ ذائقہ کے لحاظ سے نہایت شیریں ہے۔ باعتبار طبی فوائد کے قاطع بلغم، ملین طبع، مطہر کلیتین، مسمن بدن وغیرہ اس کے معمولی خواص ہیں۔

پس انجیر شاہد ہے کہ جس طرح یہ جسم صغیر ہو کر بے شمار فوائد کا مجموعہ ہے، اسی طرح وجود انسانی بھی جسماً مختصر لیکن مختلف قوتوں کا پتلا، گونا گوں جذبات کا سراپا، بوقلموں اسرار کا مجسمہ ہے۔

بے شک اس کی مٹھی بھر ہڈیوں کا ڈھانچہ عالم تکوین کی غیر محدود کوہ پیکر ہستیوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ مگر ان ہڈیوں میں ہی وہ طاقت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں اور سمندروں کے طوفانوں کو مسخر کر سکتی ہے--!

دوسری شہادت زیتون کی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح زیتون میں روغن حلول کیے ہوئے ہے اور زیتون کی قدر اس کے روغن ہی کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح انسانی جسم میں روح کا حلول ہے اور اس کا شرف بھی اس کی روح ہی سے ہے ورنہ انسان مٹی کا ایک ڈھیر یا حشرات الارض کی گھناؤنی غذا ہے اور بس۔

یہاں پر دو سوال اور قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ جناب باری نے زیتون ہی کو شہادت کے لیے کیوں منتخب کیا، جب کہ یہ فائدہ اور روغن دار پھلوں یا اسی قسم کے تخموں سے بھی حاصل ہو سکتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن کریم کے اولین مخاطب ہیں ان کے سامنے جو چیز بکثرت موجود تھی، وہ زیتون ہے اور جو فوائد غذا و دوا کے اعتبار سے انہیں حاصل ہو رہے تھے، وہ بالکل ان پر واضح و آشکار تھے۔

دوسرا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جب کہ روح جسم سے اعلیٰ واشرف اور اس پر حاکم ہے تو اس کی شہادت کو جسم کی شہادت سے مقدم ہونا چاہیے اور اس لیے والتین کی جگہ والزیتون

کے لفظ سے سورت کو شروع کرنا چاہیے تھا۔ یہ درست ہے، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ دلیل و اثبات کے موقع پر مقدم ہونے کا وہ چیزیں حق رکھتی ہیں جو تجارب و محسوسات کے دائرہ میں ہوں۔ قطع نظر فلسفہ جدیدہ کے جس کی بنیاد کا سنگ اولین ہی تجربہ ہے۔ اگر ارسطو و افلاطون کے فلسفہ کو دیکھو اور کم از کم علامہ بہاری کی سلم کے آخر میں برہان کی بحث سامنے رکھو، تو معلوم ہو جائے گا کہ دلیل مفید یقین وہی ہو سکتی ہے جس کے مقدمات کی ترتیب امور یقینیہ اور تجربہ پر ہو، یا کم از کم ایسے مقدمات کی طرف ان کی تحصیل ہوتی ہو۔ بہرحال جسم اور اس کے فوائد محسوس بالکل ظاہر ہیں اور روح غیر محسوس ہے۔ پس اس لیے جسم کی شہادت کو حق تھا کہ وہ روح کی شہادت پر مقدم ہو اور سورت کو والتین ہی کے لفظ سے شروع کیا جائے۔

نکتہ

زیتون کے لفظ میں ایک اور لطیف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ جب زیتون سے روغن نکال لیا جاتا ہے تو اس سے دوسرے فوائد کے علاوہ چراغ بھی روشن ہو سکتا ہے اور وہ اپنے ارد گرد تمام چیزوں کو منور کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ روح جو قفس عنصری میں مقید ہے اگر بقدر طاقت بشری اس کو بھی علائق مادیہ سے پاک و صاف کر لیا جائے، تو پھر اس سے بھی بہت سی تاریک روحیں منور اور ظلماتی قلوب روشن ہو سکتے ہیں!

طور سینین کی شہادت

''طور سینین'' کی تفسیر میں تمام مفسرین اپنی عادت قدیم کے موافق بہت سے احتمالات بیان کرتے ہیں۔ مگر در اصل یہ سب تکلف ہے۔ اس سے مراد وہی پہاڑ ہے جو حضرت موسیٰؑ کے لیے جلوہ گاہ ربانی اور بنی اسرائیل کے لیے قانون شریعت کا مہبط تھا۔ ابن جریر نے بھی

اس کو پسند فرمایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

واولی الاقوال فی ذالك بالصواب قول من قال طور سینین جبل معروف۔

صواب تر قول اس بارے میں اس شخص کا ہے جو کہتا ہے کہ طور سینین سے مراد مشہور و معروف پہاڑ ہے۔

یہ شہادت ایک عجیب و غریب شہادت ہے جو ثابت کرتی ہے کہ ضعیف و ناتواں انسانی پتلا میں مادی ترقی کی قوت کہاں تک ہے اور وہ اپنے کمال کے بازوؤں سے اڑ کر کہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ اس سے پہلے تم بنی اسرائیل کی حالت پر نظر کرو۔ وہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اسرائیلی برکت اور حضرت ابراہیمؑ کے خدا کے وعدے کو فراعنہ کے قدموں میں پامال کر دیا تھا۔ اس بد بخت قوم نے فطرت کی سب سے زیادہ گراں قدر نعمت (یعنی حریت) کو ہمیشہ غیروں کی چوکھٹوں پر قربان کیا!

یہی بدنصیب بنو اسرائیل تھے جو انسانی عبدیت کے خون سے پیدا ہوئے، غلامی کے دودھ سے پلے، استبداد کی آب و ہوا، میں بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ شرف قومی کا پاک جذبہ جس کی حفاظت دل کے خون اور دماغ کی روح سے ہونی چاہیے تھی، فراموش کر دیا گیا۔ آہ! صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے دیکھا کہ ظالم مصریوں کی خون آشام تلواریں اپنی پیاس ان کے معصوم بچوں کے خون سے بجھاتی ہیں اور ان کی مخدّرات کی عصمت کی فرعونیوں کے وحشت کدہ پر قربانی ہو رہی ہے:

يُذَبِّحُونَ اَبْنَآءَ كُمْ وَ يَسْتَحْيُونَ نِسَآءَ كُمْ (۲:۴۹)

مگر تاہم اس بے حسی کی صدا سے باز نہ آئے کہ:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ (۵:۲۴)

بدقسمت عبرانیوں کی یہ حالت تھی، مگر جب جبل طور پر (جس کی قسم اس سورت میں کھائی

گئی ہے) موسیٰ علیہ السلام کو قانون ملت عطا ہوا اور اس پر آئندہ نسل نے عمل کیا تو پھر وہ حالت ہوئی کہ جو غلام تھے وہ شہنشاہ ہو گئے۔ جس قوم کو مصر میں سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے بھی پیٹ بھرنے کے لیے چین سے نصیب نہ تھے، اس کے قدموں پر شام کے خزانے جمع کیے۔ کنعانیوں اور حبشیوں کے دلفریب سبزہ زاروں کی یہ قوم مالک ہوئی۔ اموریوں[1] اور فرزیوں، حویوں اور یبوسیوں کی دودھ وشہد بنانے والی زمین ان کے قبضہ میں آ گئی۔ اسی کے آفتاب جلالت وسطوت سے بابل ونینوا کے قصر جگمگا اٹھے اور اسی کے رعب وشوکت نے مصر کے ایوانوں کو ہلا دیا۔ یہ سب کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ پہلے وہ صراط مستقیم وراہ حق سے بے خبر تھی اور اب اس پر عامل ہوگئی۔ پہلے وہ اس قانون الٰہی سے جو طور پر نازل ہوا، جو ترقی کے بے شمار اسرار سے معمور تھا، محروم تھی اور اب اس کی پرستار ہوگئی۔ پس خداوند تعالیٰ نے اسی لیے طور کو جس سے ایک بہت بڑی قوم کے عروج وزوال کی تاریخ وابستہ تھی، بطور شاہد کے پیش کیا کہ دیکھو! یہ طور شاہد ہے کہ انسان کو ہم نے اشرف ترین پیدا کیا۔ کیا باوجود ایک حقیر وضیعف ہستی ہونے کے اس کی پرواز سب سے زیادہ بلند نہیں ہے؟

جس طرح کہ پہلے جسم کی شہادت اور اس کے بعد روح کی شہادت بیان کی گئی تھی۔ اسی طرح تیسری شہادت میں پہلے جسمانی و مادی ترقی کا ثبوت دے کر چوتھی شہادت اس کی روحانی ترقی کی دلیل قرار پائی۔

بلد امین کی شہادت

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنَ۔ امین امن سے مشتق ہے جس کے معنی حفاظت کرنے کے ہیں۔ امانت کو امانت اسی لیے کہتے ہیں کہ اس میں حفاظت کی جاتی ہے۔ امین اگر اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اپنے حقیقی معنی امن میں یہاں مستعمل ہے، تو اس کے معنی ہوں گے،

''حفاظت کرنے والا'' یا مثل قتیل بمعنی مقتول اسم مفعول کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، تو اس وقت اس کے معنی ہوں گے محفوظ۔ بہر حال دونوں صورتوں میں بلد امین سے مراد مکہ معظمہ (زادھا اللہ شرفہا) ہے:

كذا صرح الكشاف والرازى و البيضاوى وغيرهم۔

پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ فارعن الدم (جو شخص کسی کو قتل کر کے بیت اللہ میں آچھپے) کے قصاص سے اور جانوروں کے شکار سے جب کہ وہ حرم میں داخل ہو جائیں، حفاظت کرنے والا ہے۔ کیونکہ نص قرآنی میں دوسری جگہ ''حرما امنا'' موجود ہے۔

دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ یہ کعبہ محترمہ قتل و غارت جنگ و جدال وغیرہ سے محفوظ ہے۔ یہ چوتھی قسم ہے اور انسانی شرف کے جس شعبہ پر یہ شہادت لائی گئی ہے، اس کو ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے ایک مختصر مقدمہ پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

محبت کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ محبوب اور اس کے جمیع متعلقات سے الفت ہو۔ اس کے دیار و لباس کی یاد بھی وہی اثر دل پر کرے، جو اس کی چشم بہار کے اشارے کرتے ہیں۔ امرالقیس نے جب ایک سفر میں اپنی محبوبہ کے قیام کے آثار کو دیکھا تو بے خود ہو گیا اور یاران سفر سے کہنے لگا:

قفا نبك من ذكرىٰ حبيب و منزل

بسقط اللوىٰ بين الدخول فحومل

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ محبوب کے سوا کسی سے محبت نہ ہو۔ اس کا روئے آتشیں قلب میں وہ آگ روشن کر دے کہ ماسوا کی الفت خاکستر ہو جائے اور یہ عالم ہو:

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تو ہے!

یہ مرتبہ پہلے سے اعلیٰ ہے اور اسی کا نام مرتبہ خلت ہے، جس کا نمونہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہم السلام تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے تو یہ مقام ظاہر ہے۔ کہ جب

ان سے ان کے جگر گوشہ و چشم و چراغ اسماعیلؑ کی قربانی کے لیے ارشاد ہوا تو وہ بلا تامل تیار ہو گئے اور اس پر حضرت باری سے یہ خطاب عطا ہوا:

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا

لیکن حضرت اسماعیلؑ بھی اس مقام خلت سے محروم نہ تھے۔ چنانچہ جب راہ حق میں ان کو قربان کرنے کے لیے کہا گیا (اِنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی (۱۰۲:۳۷)) تو انہوں نے بلا تامل عرض کیا کہ اے باپ! اگر آپ قربان کرنے کے لیے تیار ہیں تو میں بھی قربان ہونے کے لیے حاضر ہوں۔

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۰۲:۳۷)

کعبہ مکرمہ جو انہی پرستاران حق وفدا کاران ملت کی بنا کردہ تعمیر ہے، گویا تعلیم خلت کی درسگاہ ہے، جس کو یہ بزرگوار تعمیر کرتے جاتے تھے اور اپنے جذبہ عشق میں معمور ہو کر کہتے جاتے تھے:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲:۱۲۷۔۱۲۹)

اے ہمارے خدا! تو ہمارے اس کام بناء کعبہ کو قبول فرما اس لیے کہ تو ہی ہماری دعا کو سننے والا اور ہمارے کاموں کو جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! اب تو ہم کو اپنا فرمانبردار بندہ بنالے اور ہماری نسل سے ایک مطیع ومنقاد امت قائم کر۔ اے خدا! اپنے ارکان عبادت ہم کو ہدایت کر اور ہم پر رحمت نازل فرما کیونکہ تو ہی تواب و رحیم ہے اور پھر اس امت میں ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو ان میں سے ہو، وہ رسول تیرے احکام ان کو سنادے اور تیری کتاب و حکمت کی باتیں ان کو سکھائے۔ تو سب کچھ کرسکتا ہے، اس لیے کہ تو سب پر غالب اور سرچشمہ حکمت ہے۔

پس درسگاہ خلت یعنی بیت ابراہیمی اس پر شاہد ہے کہ انسانی روح کہاں تک ترقی کر سکتی ہے اور اس کی انتہا کیا ہے؟ تم کو معلوم ہو گیا کہ اس کی ترقی اس حد تک ہے جہاں پہنچ کر ایک ہی مقصود، ایک ہی مطلوب اور ایک ہی شاہد و مشہود سامنے ہوتا ہے، جس کی چشم و ابرو کے اشاروں اور دہن حق طلب کی مسکراہٹ پر اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی قربان کر دیا جاتا ہے۔

اے گم گشتگان طریق! اگر دین حنیف تمہارے ہاتھوں میں، اسماعیلی خون تمہاری رگوں میں اور ابراہیمی دعا کی امت مسلمہ تم ہو، تو پھر تمہارے لیے ذریعہ فلاح و نجات وہی خلت، وہی جوش محبت، وہی سودائے عشق، وہی طریق ابراہیمی ہے، جس کی شہادت تمہارا کعبہ مکرمہ بزبان حال پیش کر رہا ہے اور اس کی صدا اس کے در و دیوار سے آ رہی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس امر کو مفصل بیان کیا ہے کہ روح و جسم کا وجود اور ان کا اجتماع دوسرے جانداروں میں بھی ہے لیکن حصول سلطنت اور مقام خلت جن پر تیسری و چوتھی قسم شاہد ہے، یہ انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان دو آخری خصوصیتوں میں سے پہلی قوت حیوانیہ انسانیہ، اور دوسری قوت ملکوتیہ کا خاصہ ہے۔ پس ان خصائص و قویٰ، ان فوائد و منافع کے انکشاف کے بعد کون ہے جو اس میں شک کر سکتا ہے کہ:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔

استفسار

از مولوی وصی احمد صاحب بلگرامی

جناب علامہ دوراں وحید الزماں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

دام مجدکم

پس از سلام مسنون گزارش یہ ہے کہ جناب مولوی مظہر الدین صاحب شیر کوٹی نے جو سورہ والتین پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے متعلق چند ضروری استفسارات ہیں۔ ملاحظہ فرماتے ہیں:

"انجیر، زیتون، طور سینا، مکہ معظمہ، اس دعویٰ پر شاہد ہیں کہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر حالت میں پیدا کیا ہے۔"

طور سینا اور مکہ معظمّہ کی شہادت تو واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں نور وحدت سے انہی مقاموں پر منور ہوئیں۔ ضعیف انسان کی بزرگی پر یہ دونوں صاد کرتے ہیں اور اس لیے گواہ لائے جا سکتے ہیں۔ مگر تین اور زیتون کی شہادت کے متعلق جناب موصوف یوں فرماتے ہیں:

۱۔ انجیر ایک نہایت چھوٹا پھل ہے، لیکن غذا و دوا میں بے شمار فوائد رکھتا ہے۔ ذائقہ کے لحاظ سے نہایت شریں ہے۔ باعتبار طبی فوائد کے قاطع بلغم، ملین طبع، مطہر کلیتین، مسمن بدن وغیرہ اس کے معمولی خواص ہیں۔ پس انجیر شاہد ہے کہ جس طرح جسم صغیر ہو کر بے شمار فوائد کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح وجود انسانی بھی جسماً مختصر لیکن مختلف قوتوں کا پتلا ہے۔

۲۔ جس طرح زیتون میں روغن حلول کیے ہوئے ہے اور زیتون کی قدر اس کے روغن ہی کی وجہ سے ہے، اسی طرح انسانی جسم میں بھی روح کا حلول ہے اور اس کا شرف بھی

اس کی روح ہی سے ہے ورنہ انسان مٹی کا ایک ڈھیر ہے اور بس۔

ہم نے سب مانا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح انجیر اپنے جسم صغیر میں بے شمار فوائد اور زیتون اپنے قالب میں تیل کا خزانہ رکھتا ہے، اسی طرح روئے زمین پر اور نیز ملک عرب میں ہزاروں لاکھوں ایسے پھل ہیں، جو یہی خواص رکھتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ اتنی بڑی شہادت پیش کرتے وقت جناب باری نے انجیر اور زیتون ہی کو چنا۔

جناب موصوف کی توضیح سے تسکین نہیں ہوتی۔ انگریزی پڑھنے والے طلباء کی آنکھیں اور دل ظاہر ہے کہ آج کل کلام مجید کی معرفت ونکات سے نابینا ہیں۔ اندھا آدمی مجبوراً ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس صورت میں بینا آنکھوں کا فرض ہے کہ صحیح راستہ بتلا دیں۔ لہذا یہ عریضہ ارسال خدمت گرامی ہے کہ تین اور زیتون کی شہادت پر شکوک مذکورہ بالا کا لحاظ کرتے ہوئے جناب مزید روشنی ڈالنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ باعث مشکوری ہوگا۔..........والسلام؛

تفسیر

از

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

سورة التين

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ○ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ○ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ○ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ○ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ○ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ○

انجیر اور زیتون، طور سینا اور مکہ معظمہ شاہد ہیں کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا۔ پھر اس کو بد سے بدتر حالت میں پھینک دیا مگر وہ لوگ کہ ایمان لائے اور عمل صالح کیے تو ان کے اعمال کے نتائج صرف بہتری ہی کے لیے ہیں۔ ان کے عمل صالح کا بدلہ کبھی منقطع نہ ہوگا ہمیشہ پھل دے گا۔ پس اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد کون ہے جو اعمال کے نتائج سے انکار کرے گا اور اس بارے میں رسول ﷺ کی تعلیم کو جھٹلائے گا؟ کیا سب سے بڑا حکم کرنے والا خدا ہی نہیں ہے جس کے قانون جزا و سزا میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

قرآن حکیم کے فہم ودرس کا جو ذوق آپ کے خط سے ظاہر ہوتا ہے، اس سے فقیر نہایت خوش وقت ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ذوق میں برکت وثبات عطا فرمائے اور آپ کے امثال ونظائر سے ہمارے جدید مدارس کی عمارتیں معمور ہو جائیں۔

آپ کا سوال دراصل مسئلہ ''اقسام القرآن'' سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی قرآن حکیم کی جن سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حروف قسم کے ساتھ بعض اشیاء کا ذکر فرمایا ہے، ان کی حقیقت اور جواب قسم سے ان کا ربط وتعلق۔ ازاں جملہ سورۃ والتین ہے اور اس میں سب سے پہلے تین وزیتون کی قسم نظر آتی ہے۔ درس وفہم حقائق قرآنیہ کی مختلف راہیں ہیں اور بسا اوقات ان کی حقیقت مختلف روشنیوں میں نظر آتی ہے۔ تین وزیتون کے متعلق ایک تفسیر امام رازی رحمتہ اللہ علیہ کی تھی جس کو مولانا مظہر الدین صاحب نے اپنے مضمون میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے اور ان کے خصائص کو نوع انسانی کے جسم وحقیقت کے خصائص سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سورت کے موضوع اور بقیہ اقسام کے ربط کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے۔ مزید غور وفکر اور جستجوئے حقیقت کے لیے قدم اٹھانا چاہیے۔ میں آپ کے سوال کا جواب دو صحبتوں میں دوں گا۔

چند مقدمات مہمہ

سب سے پہلے چند مقدمات آپ کے سامنے آ جائیں جن پر ہمارے تمام مباحث تفسیر مبنی ہیں۔

۱۔ قرآن حکیم کی ہر سورت کا ایک موضوع (سب جیکٹ) اور اول سے لے کر آخر تک وہ سورت اسی پر مبنی ہے۔ جس قدر مطالب درمیان میں آ گئے ہیں وہ سب کے سب اسی ایک موضوع اصلی کے ناگزیر وضروری اطراف بحث وتعلیم ہیں۔

۲۔ ہر سورت کی ابتدا وانتہا اس موضوع کے معلوم کرنے کی کنجی ہے۔

۳- جب ہر سورت کا ایک موضوع ہے تو یہ چیز بھی ضمناً آپ کو معلوم ہوگئی کہ قرآن کی تمام آیات باہم مربوط و مسلسل ہیں اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ سلسلہ بیان بتدریج اجمال سے تفصیل، دعویٰ سے دلیل، اور تعلیم سے امثال و نظائر کی طرف بڑھتا اور کھلتا جاتا ہے۔ اسی کو قرآن حکیم نے تصرف آیات سے جا بجا تعبیر کیا ہے۔ ''صرف'' کے معنی لغت میں ''رد الشیء من حالۃ الی حالۃ'' کے ہیں۔

(کما صرح به الاصفهانی)

۴- ''قسم'' کے معنی شہادت و دلالت کے ہیں، قرآن حکیم نے جس چیز کو حروف قسم کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ ایک شاہد ہے جو اپنے مابعد دعویٰ کے لیے دلیل پیش کرتا ہے۔ قسم کا مقصد استشہاد ہوتا ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ خدا شاہد ہے کہ ہم نے جھوٹ نہیں بولا سورہ والفجر میں ہے:

''هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ'' (۸۹:۵)

یعنی ان چیزوں میں صاحب عقل کے لیے بڑی ہی شہادت ہے۔ منافقین کہتے تھے کہ:

'' نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ'' (۶۳:۱)

ہم گواہی دیتے ہیں آپ اللہ کے رسول ہیں۔

خدا نے ان کی تکذیب کی اور کہا:

'' اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ''(۵۸:۱۶)

انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ منافقین نے شہادت دی تھی۔ قسم نہیں کھائی تھی۔ پس خدا نے خود ہی شہادت کو قسم سے تعبیر کر کے حقیقت کھول دی۔

لیکن چونکہ عام مفسرین متاخرین نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا، اس لیے وہ اس دھوکے میں پڑ گئے کہ قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جس میں بڑائی اور عظمت ہو۔ اس لیے

تمام قسموں میں صرف عظمتوں ہی کو تلاش کرتے رہے۔ ان کی شہادت حق و دلالت حقائق پر نظر نہ ڈالی۔ امام رازیؒ گو فرماتے ہیں، کہ قسم ایک طرح کی دلیل ہے، لیکن چونکہ اصل حقیقت سے پوری طرح متاثر نہیں ہیں اس لیے اس غلطی کو شروع کر دیتے ہیں جو اعتراف معنی دلیل کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی تین اور زیتون کی عظمت اور بزرگی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ پھر جب اور کچھ نظر نہیں آتا تو فرماتے ہیں کہ تین (انجیر) کا مزہ بہت اچھا ہے اور وہ معدے کے لیے مسہل و ملین ہے اور زیتون کی لکڑی کے اندر تیل ہے۔ گویا نہ تو دنیا کے اندر کوئی اور پھل ملین ہے اور نہ کوئی اور شے اپنے اندر روغن رکھتی ہے......!

سچ یہ ہے کہ متاخرین میں یہ فضیلت و مزیت اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے ارشد تلامذہ علامہ ابن قیم کے لیے مخصوص کر دی تھی کہ حقائق و معارف کتاب و سنت کے جمال حقیقی کو بے نقاب کریں اور جو پردے متاخرین نے یکے بعد دیگرے ڈال دیئے ہیں، ان کو اللہ کی بخشی ہوئی قوت مجددہ و مصلحہ سے چاک چاک کر دیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے ان دو عظیم الشان انسانوں نے اقسام القرآن کی اس حقیقت کو جا بجا واضح کیا ہے اور موجودہ زمانے میں سب سے بڑا خوش نصیب انسان وہ ہے جس کے دلوں کو اللہ ان مصلحین حقیقی کی تصنیفات کے فہم و درس کے لیے کھول دے کہ ان کا نور علم مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست ماخوذ تھا۔

موضوع سورۂ والتین

دنیا میں انسان اپنے اندر دیکھتا ہے تو اس کو جذبات و مؤثرات کا ایک عجیب مخلوط اور متضاد ہجوم نظر آتا ہے۔ باہر دیکھتا ہے تو اس کی ناکامیاں اور مایوسیاں اس کی کامیابیوں اور امیدوں سے زیادہ نظر آتی ہیں۔

جذبات کے اعتبار سے وہ ایک ہی وجود ہے جو کبھی فرشتوں کی طرح محبت و ہمدردی اور شرافت وعفت کا پیکر ہے اور کبھی قتل و ہلاکت اور خونریزی و سفاکی میں سانپوں کے زہر سے بدتر اور درندوں کے پنجوں سے اسفل ہے۔ وہی انسان جو جانوروں کو تکلیف میں دیکھ کر ہمدردی کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات اپنے بھائیوں کا بے دریغ خون بہانے لگتا ہے تاکہ ان کے خون سے اپنی خودغرضی کی پیاس بجھائے۔

خارجی اعمال کے لحاظ سے اس کی بوقلمونی اور زیادہ عجیب ہے۔ وہ ایک ہی وجود ہے جو کبھی تاج و تخت حکومت پر جلوہ آراء ہوتا ہے اور کبھی کتوں کی طرح غلامی کی خاک پر لوٹتا ہے۔ کبھی اس کی ہمت سر بفلک عمارتوں کے بنانے، پہاڑوں کے کاٹنے، سمندروں کے مسخر کرنے سے نہیں تھکتی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتوں کی ایک دیوار کو کھڑا کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ کبھی بجلی سے ڈرتا ہے، طوفان سے لرزتا ہے، آسمان کو دہشت و خوف سے دیکھتا ہے اور پھر اس قدر ان کے مظاہر و شئون سے مرعوب ہو جاتا ہے کہ ان کی پرستش و بندگی شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ان کے آگے جھکنے اور عاجزی ہی کے لیے ہوں۔ ان کے تنزل و تسفل کے لیے یہ مثال بھی کافی نہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب کہ دنیا میں پتھر کے ان ٹکڑوں کے لیے جو راستوں میں ٹھوکریں کھاتے ہیں، عزت ہوتی ہے۔ پر انسان کے لیے کوئی عزت باقی نہیں رہتی۔ وہ انسان ہو کر پتھروں کے آگے ماتھا ٹیکتا، ان کو اپنے آقا اور خداوند کی طرح پوجتا اور اپنی حیات و ممات کو ان کی رضا و غضب میں منحصر یقین کرتا ہے۔ کتا زیادہ سے زیادہ انسان کے آگے جھکتا ہے کہ وہ کتے سے اشرف و اعلیٰ ہے۔ گھوڑا اور ہاتھی انسان کے چاکر بن جاتے ہیں کہ انسان کی عظمت کا مقابلہ نہیں کر سکتے، مگر انسان کتے سے بھی بدتر اور گھوڑے اور ہاتھی سے بھی اسفل ہے کہ اپنے سے اعلیٰ کے آگے نہیں بلکہ اپنے ہی جیسے کے سامنے یا اپنے

سے بھی بدتر کے آگے جھکتا اور اوندھا ہوتا ہے۔!

تم کسی کتے کو نہیں دیکھو گے کہ وہ کسی کتے کے آگے عاجزی کرے، لیکن یہ انسان ہی ہے کہ اپنے جیسے ایک دوسرے انسان کو چاندی، سونے کے تخت پر بٹھاتا ہے اور پھر کتوں کی طرح اس کے آگے زمین پر لوٹتا اور گردِ مذلت چاٹتا ہے۔

اعمالِ انسانی کے اس اختلاف و تضاد اور انفعالات و تاثراتِ عملیہ کی اس بوقلمونی و رنگارنگی میں انسانی فطرتِ اصلیہ کی حقیقت گم ہو جاتی ہے۔ کچھ نہیں کھلتا کہ یہ عجیب جانور جو سب سے بڑا بھی ہے اور سب سے چھوٹا بھی، اس کی اصلی متاعِ فطرت کیا تھی جو اسے دی گئی تھی؟ وہ فی نفسہٖ شیطان ہے یا فرشتہ؟ بھیڑیا یا ہے یا بکری؟ تاریکی ہے یا روشنی؟ نیک ہے یا بد؟ اچھا ہے یا برا؟

مسئلہ خیر و شر فطرت انسانی

یہ سوال انسان کی اصلی فطرت و جبلت کی نیکی اور بدی کا ہے۔ یعنی کیا بالطبع وہ نیک بنایا گیا ہے یا بد؟ یا دونوں؟ اس کے داخلی جذبات و داعیات کی کشاکش اور خارجی اعمال و نتائج کا میدان تو نور و ظلمت، ملکوتیت و بہیمیت، حسن و بدروئی، علو و تسفل، عظمت و ذلت، نیکی و بدی، دونوں کا مجموعہ نظر آتا ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دراصل وہ کیا ہے؟

دنیا میں ابتدا سے لے کر اب تک اس سوال کے متعلق تین مختلف مذاہب نظر آتے ہیں:

۱۔ انسان کی اصلی جبلت و فطرت بدی ہے، لیکن باہر کی تربیت اس کو عارضی طور پر خوشنما کر دیتی ہے۔ وہ خصائص فطرت کے اعتبار سے ایک خالص حیوان ہے۔ لیکن تربیت پذیری کے اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتا ہے۔ درخت کی جڑ اور شاخیں متناسب نہیں ہوتیں، لیکن ان کو کاٹ کر اور چھیل کر ہم درست کر لیتے ہیں۔ فطرت کی تمام خلقت کا یہی حال

ہے۔ اصل فطرت میں قوام واعتدال نہیں ہوتا۔ چھیل چھال کر اسے سڈول بنایا جا سکتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ باہر کی صناعی تربیت سے ایک نیا رنگ اپنے اوپر چڑھا لیتا ہے، لیکن جب اوپر کا رنگ کمزور ہو جاتا ہے تو اصلی تہ نظر آ جاتی ہے۔ بڑے سے بڑا مہذب انسان بھی غصہ وانتقام میں درندہ بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مصنوعی رنگ اتر گیا اور اس کی اصلی فطرت شر ابھر آئی۔

یہ مذہب ''مذہب شر'' یا ''مذہب یاس'' ہے۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو شر اور یاس کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یونان میں دیو جانس کلبی (ڈائیگونس) (Diogenes) اسی فلسفہ اخلاق کا مشہور پیشوا گزرا ہے۔

۲- دوسرا مذہب ان لوگوں کا ہے جو انسان کی فطرت کو بالکل ایک سادہ حالت میں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں نہ تو نیکی ہے اور نہ بدی۔ نہ وہ کانٹوں کی چبھن ہے اور نہ پھولوں کی مہک۔ وہ محض ایک منفعل، اثر پذیر اور نقش انگیز وجود ہے جو اپنے ساتھ کچھ نہیں لاتا مگر دنیا میں آ کر جو کچھ پاتا ہے لے لیتا ہے۔ وہ ایک دامن ہے جس کے اندر سوائے گنجائش اور عمق کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس میں ہر طرح کا بوجھ بھر لینے کی صلاحیت ہے مگر ابھی کوئی چیز اس میں بھری نہیں گئی ہے۔ اب اگر اس کو پتھر ملا ہے تو اسی کو بھر لے گا، پھول ملے ہیں تو ان کو اٹھا لے گا۔ بہ تشبیہ واضح تر یہ کہ انسان کی فطرت اصلاً ایک سفید کاغذ ہے۔ اس پر کوئی نقش نہیں ہوتا۔ نہ تو کانٹے کی تصویر ہوتی ہے اور نہ پھول کی۔ اب جو کچھ اس پر بنایا جائے گا بن جائے گا۔

حکمائے یونان میں اس مذہب کا ایک دور رہ چکا ہے۔ معتزلہ نے بھی زیادہ تر اسی کی پیروی کی تھی۔ آج یورپ میں بھی حکمائے اخلاق کا ایک بڑا گروہ یہی کہتا ہے۔

۳- تیسرا مذہب ''جامع خیر و شر'' ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ:

آدمی زادہ طرفہ معجون مست!

نیکی اور بدی دونوں اس کی فطرت میں موجود ہیں۔ بالقوت وہ شیطان اور فرشتہ دونوں ہے۔قوت ملکوتی و بہیمی دونوں رکھتا ہے۔ دنیا میں آ کر جس قسم کے خارجی مؤثرات ملتے ہیں، انہی کے مطابق اس کی کوئی ایک قوت نشو ونما پاتی اور بروز کرتی ہے۔اگر وہ اثرات اس کے لیے جمع ہو جائیں جن کو تم نیکی کے لقب سے پکارتے ہو،تو اس کی قوت ملکوتی ابھرے گی اور چمکے گی ،لیکن اگر برخلاف اس کے بدی کا گردوغبار چھا جائے گا تو نیکی کی چمک ماند پڑ جائے گی اور بدی کی تاریکی پھیل اٹھے گی ، اس مذہب کے پیروؤں کے نزدیک انسان کے اندر بالقوت ملکوتیت و بہیمیت دونوں ہیں،مگران کا فعل تربیت وتاثرات سے نمود پکڑتا ہے۔گویا نیکی اور بدی دو بیج ہیں جن کو انسان اپنے ساتھ دنیا میں لاتا ہے۔پھر جس بیج کو تربیت وتاثر کا پانی مل جاتا ہے، وہی پھولتا پھلتا اورتناوردرخت بنتا ہے۔

دنیائے قدیم وجدید دونوں میں اس مذہب نے بہت ترقی ومقبولیت حاصل کی ہے۔ ارسطو کا بھی یہی مذہب تھا اورتقریباً تمام حکمائے اسلام نے اسی کو قبول کیا ہے۔ ابن مسکویہ جس نے یونانی اخلاق کوسب سے زیادہ مشرح ومنظم لکھا ہے، اسی مذہب کا داعی ہے۔ دورجدید کے حکمائے اخلاق میں بھی یہی مذہب زیادہ مقبول ہے۔امام فخرالدین رازی وغیرہ تمام مفسرین قرآن میں اسی مذہب کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ”وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ“(۹۰:۱۰) اور فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا“ (۹۱:۸) وغیرہ آیات کریمہ کی تفسیر اسی مذہب کی بنا پر کرتے ہیں۔کہا جاسکتا ہے کہ مسئلہ خیر وشر فطرت کے متعلق دنیا کا غالب اورعام اعتقاد یہی ہے اور چونکہ انسانی اعمال ونتائج میں خیر وشر دونوں نظر آتے ہیں، اس لیے ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہی مذہب زیادہ صحیح واحق ہے۔

القرآن الحکیم

قرآن حکیم نے دین الٰہی کا دوسرا نام ''العلم'' رکھا ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَ كَ مِنَ الْعِلْمِ (۲:۱۲۰)

اور اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، بعد اس کے کہ تیرے پاس علم یعنی دین الٰہی آ چکا ہے۔

ہر جگہ گمراہ قوموں کے بغی وضلالت وملامت کرتے ہوئے کہا:

فَمَا اخْتَلَفُوْآ اِلَّامِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۵:۱۷)

عاملین قرآن کی نسبت کہا :

فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُو الْعِلْمَ (۲۹:۴۹)

وہ ان کے سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا۔

نیز کہا کہ یہ " برھان " ہے، " بصائر " ہے، " نور " ہے، "بصیرت" ہے اور ہر جگہ کفر کو کہا کہ وہ " ظن " ہے " شك " ہے، " تخمین " ہے اور اٹکل کی باتیں اور قیاسات ہیں: مَالَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵:۲۴) پھر دین الٰہی کے ماننے اور اطاعت کرنے کو ''ایمان'' کہا اور ایمان والوں کو ''مومن'' ایمان امن سے ہے اور امن کے معنی " طمانیته النفس'' اور زوال خوف وشک کے ہیں۔ ان تمام تصریحات سے واضح ہوا کہ دنیا میں علم ویقین صرف ایک ہی ہے اور وہ وحی الٰہی ہے اور اس کے سوا اور جس قدر ادعاء علم کے اعلانات ہیں، ظن اور شک سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نیز یہ کہ "ایمان" کے معنی ''یقین'' حاصل کرنے کے ہیں اور مومن وہ ہے جس کے پاس "شک" کی جگہ ''یقین'' ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مومن اور غیر مومن کو " الذین یعلمون" اور " والذین لایعلمون " اور "الاعمیٰ" اور " البصیر " سے تشبیہ دی۔ یعنی صاحبان علم اور بینا اور

ارباب جہل اور اندھے!

اس بنا پر علم اضافی اور محدود تو دنیا کے پاس ہے، مگر علی الاطلاق ''العلم'' قرآن کے سوا اور کوئی نہیں اور قرآن جس کے پاس ہے وہی دنیا میں سب سے زیادہ علم اور سب سے بڑا جاننے والا ہے۔

پس شک وظن کے تمام اختلافات کو اس ''العلم'' اور البصائر'' کے آگے عرض کرنا چاہیے کہ وہی ایک حکم حقیقی ہے۔

اس عاجز نے جہاں تک غور کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ خیر وشر فطرت کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ ان تینوں مذہبوں سے الگ ہے اور تمام دنیا میں وہ پہلی آواز ہے جو انسانیت کے شرف فطری وخیریت کو ان تمام ظنون واوہام کی پیدا کردہ ذلتوں سے نجات بخشتی ہے۔ ان تینوں مذہبوں میں پہلا مذہب فطرت انسانی کو زمین کی گھاس اور مٹی کے تودوں سے زیادہ حقیر قرار دیتا ہے۔ گھاس حیوانات کی غذا ہے اور مٹی سے دیوار بنائی جاسکتی ہے۔ مگر یہ مذہب کہتا ہے کہ انسانی فطرت میں مضرت کے سوا کوئی نفع نہیں۔ یہ مغرور انسان کا اپنی نسبت پہلا مایوس فیصلہ تھا۔

اس کے بعد دوسرا مذہب سامنے آتا ہے اور اس کو ایک سادہ صفحہ قرار دیتا ہے جس میں نہ تو نیکی کا نقش ہے اور نہ بدی کا۔ بلاشبہ یہ مذہب انسان کے لیے پہلے مذہب جیسا بے رحم نہیں، تاہم یہ بھی اس فطرت کو کوئی شرف نہیں بخشتا اور ایک منفعل اور ہر طرح کے اثر کو قبول کرنے والا قرار دے کر چھوڑ دیتا ہے۔

تیسرا مذہب سب سے زیادہ مقبول، سب سے زیادہ عام اور اس بارے میں انسانی علم کی سب سے بڑی جست ہے۔ لیکن وہ بھی پھولوں کے ساتھ کانٹوں کو برقرار رکھتا ہے اور انسان کو فرشتگی اور شیطنت کا مساوی حصہ بخشتا ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ بالفطرت اس میں نیکی بھی ہے اور بدی بھی۔ پس وہ جس طرح اچھا ہے برا بھی ہے۔ اگر بدی کا پلہ نہ جھکا

تو نیکی کے پلڑے کو بھی زیادہ وزن نصیب نہیں۔ نتیجہ کے اعتبار سے اس کی فطرت یہاں بھی شرافت واحترام سے محروم ونامراد ہے۔ ذٰلِكَ مَبۡلَغُهُم مِّنَ ٱلۡعِلۡمِ۔ (۳۰:۵۳) ان تینوں مذہبوں نے فطرت انسانیہ کی حقیقت کو کھودیا اور وہ اپنا سراغ نہ پا سکے۔

یہ مذاہب حکمائے اخلاق اور عام افکار و آراء انسانی کے ہیں۔ لیکن آج جس قدر مذاہب دنیا میں موجود ہیں، ان کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ اکثر حالتوں میں تو پہلے مذہب کی دعوت دیتے ہیں۔ بعض حالتوں میں اگر ان کے شارحین تاویلات رکیکہ سے کسی بلند درجہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو بھی آخری مذہب سے آگے ان کا قدم نہیں بڑھتا۔

لیکن قرآن یعنی ''العلم'' دنیا میں اس لیے نہیں آیا کہ فطرت کے محجوب جمال کو اور زیادہ مستور کردے۔ بلکہ اس کی دعوت کی اولین حقیقت یہ تھی کہ انسانی ضلالت وظنون نے فطرت وحقیقت پر جو پردے ڈال دیئے ہیں، ان کو اس طرح چاک چاک کردے کہ انسان اپنے ہی آئینہ کے اندر اپنی صورت دیکھ لے۔ پس وہ اولین آواز ہے جس نے سب سے پہلے اس گم شدہ حقیقت کا سراغ بتلایا اور دعویٰ کیا کہ انسان کی فطرت وجبلت نہ تو محض ایک صفحہ سادہ ہے، نہ صرف بدی اور شر کی ناپاکی ہے اور نہ ملکوتیت اور بہیمیت کا مرکب، بلکہ وہ ایک خالص وکامل نیکی ہے، جس میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور کوئی قوت اس کے اندر ایسی نہیں رکھی گئی ہے جس میں بدی اور برائی کا اصلاً بیج ہو۔ وہ صرف نیکی ہی لے کر دنیا میں آتا ہے نیکی ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور نیکی ہی کے لیے اس کو سب کچھ دیا گیا ہے۔ لیکن وہ دنیا میں آ کر اپنی فطری نیکی کی حفاظت نہیں کرتا۔ اس کی نشوونما کی راہیں بند ہو جاتی ہیں اور اس کے طبیعی ابھار کو اس طرح دبا دیا جاتا ہے جس طرح کسی پودے پر ایک پتھر رکھ کر اس کی قوت پامال کردی جائے۔ پس انسان کے اندر جو کچھ ہے وہ خالص نیکی ہے اور جس قدر بھی برائی ہے وہ اس کا کسب خارجی ہے۔ نیکی اس کا فطری عمل ہے اور بدی غیر فطری، خارجی اور یکسر صناعی۔ اگر وہ نیک ہے تو یہ فطرت

ہے، اگر بد ہے تو یہ تصنع ہے۔ اس کو بیج ایک ہی دیا گیا ہے جو صرف نیکی کا ہے۔ جب وہ ابھرتا ہے تو تم کہتے ہو کہ یہ نیکی ہے۔ جب پامال کر دیا جاتا ہے تو تم کہتے ہو کہ بدی ہے۔ حالانکہ تم نہیں جانتے کہ پھل اور پتوں کا نہ لگنا کوئی الگ وجود نہیں ہے۔ بلکہ درخت کے نشو ونما کے عدم کا نام ہے۔

خدا نے اس کو روشنی دی ہے اور اس کے اندر آئینہ رکھ دیا ہے۔ وہ دنیا میں آتا ہے اور باہر کے پردوں سے اندر کی روشنی کو ڈھانپ لیتا ہے۔ باہر کے گرد و غبار سے اندر کے آئینہ کو مکدر کر دیتا ہے۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ تاریک ہے، مگر نہیں سوچتے کہ اس کی اصل روشنی تھی، تاریکی نہ تھی۔ اس نے روشنی کو چمکنے نہ دیا۔ تم کہتے ہو کہ اس کے دامن میں زنگ اور غبار تھا۔ حالانکہ زنگ اور غبار نہ تھا بلکہ صاف و شفاف آئینہ تھا۔ باہر سے گرد اڑ رہی تھی۔ اس کو چاہیے تھا کہ دامن سے ڈھانپ لیتا، مگر اس نے گرد و غبار کو پسند کیا اور آئینہ کی چمک کی قدر نہ کی۔ اب وہ غبار آلود ہے۔ کچھ دنوں کے بعد بالکل تاریک ہو کر لوہے کا ایک سیاہ ٹکڑا بن جائے گا، مگر اس لیے نہیں کہ اس کے پاس لوہا تھا، بلکہ صرف اس لیے کہ آئینہ کو صاف نہ رہنے دیا۔

یہی انسان کی وہ فطرت اصلی ہے جس کو قرآن حکیم فطرت صالحہ قرار دیتا ہے یعنی وہ فطرت جو بالکل اپنی اصلی نیکی کی حالت میں ہے اور باہر کی کسی بدی سے اس کو آلودہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہی فطرت صالحہ دین الٰہی ہے، یہی دین قیم ہے، یہی دین حنفی ہے، یہی صراط مستقیم ہے، یہی فطرت اللہ ہے، یہی صبغۃ اللہ ہے اور قرآن کی اصطلاح میں سب سے زیادہ جامع و حاوی نام اسی کا ''اسلام'' ہے۔

اور اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ انسان کی اصلی فطرت ''اسلام'' ہے اور ''کفر'' ایک صنائی اور غیر فطری عمل ہے۔ اگر ایک انسان ''مسلم'' ہے تو اس کو یوں کہو کہ وہ اپنی فطرت صالحہ پر قائم ہے۔ اس کی فطری روشنی نور دے رہی ہے۔ اس کی فطرت خیر کی قندیل کو باہر کا کوئی طوفان بجھا نہ سکا اور وہ ویسا ہی ہے جیسا فطرت نے اسے

بنایا تھا۔ لیکن اگر ایک انسان ''مسلم'' نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فطرت حقیقی کا چراغ بجھ گیا، اس کے اندر کا آئینہ زنگ آلودہ ہو گیا، گرد و غبار کی توبرتو تہوں نے اس کو سیاہ کر دیا اور وہ فطرت کی صورت حقیقی کی جگہ ایک مسخ شدہ غیر فطری و مصنوعی جانور بن گیا۔ معصیت سے یہ فطری آئینہ زنگ آلود ہوتا ہے اور کفر زنگ آلودگی کی وہ آخری حالت ہے جب کہ آئینہ بالکل سیاہ ہو گیا اور دھندلی سی چمک بھی اس میں باقی نہ رہی:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۲:۷)

اور

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲:۶)

وغیرہ تصریحات قرآنیہ میں اسی آخری مرتبہ ضلالت کی طرف اشارہ ہے اور

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (۷:۱۷۹)

......اور......

جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (۶:۲۵)

......اور......

كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۷:۱۷۹)

میں اسی فطرت صالحہ کی پامالی اور ایک غیر فطری حالت مسخ و انقلاب کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ وقت تفصیل کا نہیں، اشارات پر اکتفا کیجیے۔

اور ٹھیک ٹھیک یہی معنی ہیں مسلم کی اس مشہور حدیث کے جس کی شرح میں عجیب عجیب حیرانیاں لوگوں کو ہو رہی ہیں کہ:

مامن مولود الایولدعلی الفطرة وابواہ یهودانه وینصرانه

دنیا میں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اپنی اصل فطرت پر پھر یہودی اسے یہودی بنا

لیتے ہیں اور نصرانی نصرانی۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

مامن مولود یولد الا رھو علیٰ ھذہ الملة

یعنی جس قدر بچے پیدا ہوتے ہیں سب ملت اسلام پر پیدا ہوتے ہیں۔

انسان کی فطرت صالحہ ہی کا نام اسلام ہے اور ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، اپنی اصلی اور بے میل فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے۔ پس انسان کا ہر بچہ "اسلام" پر پیدا کیا گیا۔ اب وہ دنیا میں آتا ہے اور باہر کی ہوائیں اس کے اندر کی روشنی کو تہ و بالا کرنے لگتی ہیں۔ اگر یہودیت کے اثرات اس نے پائے، تو یہودیت کا جھونکا اس کے چراغ فطرت کو گل کر دے گا۔ اگر مجوسیت کا طوفان اٹھا تو اسی میں اس کی کشتی فطرت ڈگمگانے لگے گی پر یہ جو کچھ ہوگا۔ باہر کا اثر و کسب ہے۔ اس کے اندر کی فطرت صرف اسلام تھی۔ یعنی نیکی و خیر تھی۔

تمہید بڑھتی جاتی ہے اور یہ مبحث خود ایک مستقل مبحث ہے۔ اگر اس بارے میں قرآن حکیم کی مزید تصریحات جمع کی جائیں تو صفحوں کے صفحے اسی میں صرف ہو جائیں۔ یہی معنی ہیں ذریت انسانی کی "بلیٰ" کہنے کے جب کہ خدا نے ان سے پوچھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ کیا میں ہی تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ پس انسان کی فطرت اصلی تصدیق ہے جو اس کے اندر ودیعت کر دی گئی اور اب اگر "بلیٰ" کی جگہ یعنی تصدیق ربوبیت کی جگہ وہ انکار کرتا ہے تو یہ اس کی فطرت کی صدا نہیں ہے۔ ایک غیر فطری صناعی ہے۔

اور اسی فطرت صالحہ کا نام قرآن حکیم نے قلب سلیم رکھا ہے یعنی وہ دل جو بالکل صحیح و سالم ہو اور اپنی اصلی تندرستی و اعتدال پر قائم ہو، کوئی نیا عارضہ اور بیماری اسے نہیں لگ گئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت فرمایا کہ: اِذْ جَاءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۸۴:۳۷)۔ جب کہ وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم یعنی فطرت صالحہ غیر آلودہ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ تم کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ فطرت صالحہ وہ تھی جس کو باہر کا کوئی بڑے

سے بڑا جلوہ بھی مرعوب نہ کر سکا اور اس کے اندر کی روشنی پکار اٹھی:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۔(۶:۷۹)

اور یہی وجہ ہے کہ خدا کی شریعت کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اس فطرت صالحہ پر انسان نے صناعی و خارجی ضلالت کا جو زنگ چڑھا دیا ہے۔ اسے دور کر دے اور اس کی اصلی روشنی پھر چمک اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہدایت الٰہی کو قرآن نے "ذکر" کے لفظ سے تعبیر کیا اور ضلالت و کفر کو "نسیان" کہا "ذکر" کے معنی حفظ اور یاد کے ہیں، "نسیان" بھولنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ فطرت اصلی کو انسان بھلا دیتا ہے اور اسی کا نام ضلالت ہے۔ پس ضلالت نسیان ہوئی اور ہدایت فطرت اصلی کے بھلائے ہوئے سبق کو پھر تازہ کر دینا اسی لیے اس کو ذکر کہا۔ "نسیان" کی انتہا غفلت ہے۔ غفلت کو قرآن نے منتہائے ضلالت قرار دیا ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ، وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا، وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا، اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔(۷:۱۷۹)

ایک اور آیت بھی نسیان کے متعلق اس سرسری نظر میں سن لو:

كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۔(۵۹:۱۹)

وہ لوگ کہ انہوں نے اللہ کے رشتے کو بھلا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے نفسوں ہی کو بھول گئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نفسوں کو یعنی اپنی فطرت صالحہ کو بھول گئے۔ کیونکہ فطرت صالحہ تو وہ تھی جس نے کہا "بلیٰ" یعنی خدا کی ربوبیت اور اس کے رشتہ کا اقرار کیا تھا، اب اگر وہ اس ہستی کے رشتے کو بھلا رہے ہیں جس کے آگے فطرت اصلی "بلیٰ" کہہ چکی ہے تو اس رشتے کو نہیں بھلا رہے ہیں بلکہ اپنی فطرت ہی کو بھلا رہے ہیں۔

عود الی المقصود

بہر حال قرآن حکیم انسان کی فطرت کو خالص نیکی قرار دیتا ہے اور بدی سے اس کی فطرت صالحہ کو پاک بتلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی فطرت صرف تندرستی اور صحت ہے، البتہ وہ دنیا میں آ کر بہت سی بیماریاں مول لے لیتا ہے۔ بیماری باہر کا اثر ہے اندر صرف تندرستی ہے۔

سورۂ والتین کا موضوع اصلی یہی حقیقت ہے۔ یعنی اس میں انسان کی فطرت صالحہ کی اسی گم شدہ اصلیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس موضوع کے لیے قرآن نے مفصل درس بھی دیئے ہیں، لیکن یہ منجملہ مجمل مگر جامع وحاوی دروس کے ہے۔

گزشتہ صحبت میں یہ مسئلہ ایک حد تک واضح ہو چکا کہ سورۂ والتین کا موضوع اصلی فطرت صادقہ انسانی کے شرف و خیریت کا اعلان ہے اور یہ بتلانا ہے کہ انسان نے اپنی حقیقت وفطرت کے متعلق جس قدر مایوس فیصلے کیے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ نہ تو اللہ نے اس کی فطرت کو شر اور بدی کے لیے بنایا ہے اور نہ اس کی حقیقت اس قدر حقیر و ذلیل ہے کہ وہ کائنات ہستی کے ہر وجود ظہور کے آگے جھک جائے اور ان کے کرشموں کے سامنے اپنے تئیں حقیر ولاچار سمجھ لے۔ اگر وہ اپنی فطرت صادقہ کو عمل غیر صالح سے پامال نہ کرے تو وہ دنیا میں بڑی سے بڑی عظمت حاصل کر سکتا ہے۔

اس موقع پر اس قدر اور سمجھ لینا چاہیے کہ انسان کا اپنی فطرت صادقہ سے بے خبر رہنا، دراصل اس کی تمام ناکامیوں کی جڑ ہے۔ کائنات عالم کے دائرہ حقیقت کے لیے اس کا وجود بمنزلہ ایک نقطہ و مرکز کے ہے، پس جب تک انسان اپنے نفس کی حقیقت کو نہیں پائے گا، وہ تمام عالم کی حقیقت کو نہیں پا سکتا اور حقیقت کو نہیں پا سکتا تو اپنی تخلیق کی غرض و مقصد کو بھی پورا نہیں کر سکتا۔ سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ وہ سمجھے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس کے لیے ہے، وہ

کسی کے لیے نہیں ہے، لیکن اپنے شرف وعظمت اور خیریت وحرمت کے احتجاب نے اس حقیقت تک پہنچنے نہ دیا۔ وہ کائنات عالم کے ادنیٰ جلووں سے مرعوب وہیبت زدہ ہو گیا اور سمجھنے لگا کہ جب بجلی کی چمک مجھ سے بڑی ہے، سمندر کا طوفان مجھ سے زیادہ قہار ہے، شیر کا پنجہ مجھ سے زیادہ قوی ہے، ہاتھی کا وجود مجھ سے زیادہ عظیم ہے، حتیٰ کہ مچھر کی ڈنک اور رینگنے والے زہریلے کیڑوں کا زہر بھی میرے لیے سخت خوفناک ہے، تو پھر میری ہستی کیا ہے مجھ میں کون سی بڑائی ہو سکتی ہے؟ اسی خیال کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف تو اس نے اینٹ اور پتھر تک کی پوجا شروع کر دی اور دوسری طرف اپنے وجود کو اس قدر ذلیل سمجھ لیا کہ جھکنے، گرنے، لوٹنے، پوجنے اور بندگی کرنے کے لیے اس کے اندر ایک قوی اور دائمی استعداد پیدا ہو گئی۔ اس صناعی وخارجی ضلالت سے ہر قوت نے غیر فطری فائدہ اٹھایا اور جب چاہا ایک ادنیٰ کرشمہ قوت دکھلا کر اس کے جسم ودماغ کو اپنے آگے جھکا دیا۔

تحقیر وتذلیل نفس انسانی کی یہ انتہائی حالت اسی کا نتیجہ تھی کہ اس نے اپنی فطرت کی خیریت کو نہ سمجھا اور ہمیشہ اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ اس نے چار پایوں کو دیکھا اور سانپوں اور بھیڑیوں کی درندگی وخوفناکی پر نظر ڈالی۔ پھر اسی طرح اپنی نسبت بھی فیصلہ کر لیا کہ اس میں بدی اور بہیمیت کے سوا کچھ نہیں ہے اور اگر نیکی کا جزو ہے بھی، تو وہ بدی کے ساتھ ممزوج ومخلوط یعنی ملا جلا ہے۔

یہ تنزل انسانی کی اصلی علت اور انسانیت اعلیٰ اور خلقت کبریٰ کی گم شدگی تھی۔ سورۂ والتین نے اسی کا سراغ بتلایا ہے۔ پس فی الحقیقت اس کا موضوع انسانیت اعلیٰ کا اعلان ہے۔

انسان کے اندر جو کچھ ہے وہ اس کا نفس ہے۔ باہر جو کچھ ہے وہ آفاق ہے۔ قرآن حکیم نے جا بجا اسے تنبیہ کی ہے کہ اپنے اندر بھی دیکھے اور اپنے سے باہر کو بھی سمجھے یعنی نفس و آفاق دونوں میں تفکر کرے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱:۵۳)

عنقریب وہ اللہ کی نشانیاں آفاق اور انفس میں یعنی اپنے سے باہر اور اپنے اندر دیکھیں گے۔ یہ مشاہدہ حقیقت اصلی کو ان پر کھول دے گا اور وہ پالیں گے کہ بلاشبہ دین الٰہی کی دعوت حق ہے۔

دوسری جگہ زور دیا: وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ . (۵۱:۲۱) تم اپنے اندر نہیں دیکھتے کہ کیا ہے۔ اگر تم دیکھو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ شریعت الٰہی کوئی نئی چیز تم سے نہیں چاہتی۔ تمہاری فطرت اصلی ہی کا ظہور خالص چاہتی ہے۔ اسی کا نام دین قیم ہے۔

استشہاد و طریق استشہاد

سورۂ والتین نے اسی حقیقت کو بیان کیا ہے اور اس پر شہادت پیش کی ہے۔ بیان بمنزلہ دعوے کے ہے اور شہادت اس کی دلیل ہے۔ دعویٰ تمہیں معلوم ہو چکا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ (۹۵:۴)

ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا

اب دلیل کا حصہ باقی ہے، لیکن قبل اس کے کہ دلائل پر نظر ڈالیں، اس پر غور کر لینا چاہیے کہ اس غلطی کا اصلی سبب کیا تھا، جس کو سورۂ والتین دور کرنا چاہتی ہے۔

اس کا اصلی سبب اعمال انسانی کی رنگا رنگی اور بوقلمونی تھی۔ انسان نے جب اپنے آپ کو دیکھنا چاہا تو اپنی فطرت کو نہ دیکھ سکا کہ وہ محجوب و مستور ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے اعمال و افعال کو دیکھا تو ان کے اندر ایک عجیب متضاد اختلاف نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ نیکی و شرافت کے رقیق و لطیف جذبات نظر آتے ہیں، تو دوسری طرف درندگی و بہیمیت کی

خوفناک بھی نظر آتی ہے۔ اگر وہ فرشتوں کی طرح محبت واحسان کی آنکھیں رکھتا ہے، تو بھیڑیوں اور بچھوؤں کی طرح اس کے پاس حرص وغرض کا پنجہ اور خونریزی وسفاکی کی زہریلی ڈنک بھی ہے۔ اگر ایک طرف بادشاہوں کے زرنگار تخت اور حکموں اور فرمانروائیوں کی عظمت وکبریائی نظر آتی ہے جو انسانی عظمت وجلال کی شہادتیں دے رہی ہیں۔ تو انہی کے سامنے غلاموں کی پابزنجیر صفیں بھی دست بستہ کھڑی ہیں جو انسان کو کتے اور بلی سے بھی زیادہ حقیر ثابت کررہی ہیں، کیوں کہ نہ تو کتے نے اپنے جیسے کتے کے آگے سر جھکایا اور نہ بلی نے کبھی بلی کو سجدہ کیا۔

اس نے دیکھا کہ یہی انسان حاکم بھی ہے محکوم بھی، ساجد بھی ہے، مسجود بھی، عالم بھی ہے جاہل بھی، عاقل بھی ہے ابلہ بھی، نیک بھی ہے بد بھی، شہنشاہی کا تخت، حکمرانی کا فرمان، فتح مندی کی تلوار، نیکی کی فرشتگی اور سچائی کی قدوسیت بھی وہی ہے اور غلامی کی خاک، محکومی کی ذلت، مقتولی کی گردن، بدی کی شیطنت اور شر کی رذالت بھی اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

یہی انسان ہے جو رات کو دروازوں پر پاسبانی کرتا ہے تاکہ اس کے ہم جنس گھر کے اندر امن سے سوئیں اور یہی انسان ہے کہ دوسری طرف سے آکر مکان میں نقب بھی لگاتا ہے تاکہ اپنے ہم جنسوں کو دکھ اور نقصان پہنچائے۔ اگر عبادت گاہوں کے اندر فرشتے نہیں آتے بلکہ انسان ہی ہوتے ہیں، تو ڈاکوؤں کے جتھوں کے اندر بھی بھیڑیئے جمع نہیں ہوتے بلکہ آدم ہی کی اولاد ہوتی ہے۔

پس اعمال انسانی کی اس رنگارنگی اور نور ظلمت کے اس اختلاط کو دیکھ کر وہ اس دھوکے میں پڑ گیا کہ جس مخلوق کے اعمال کا یہ حال ہے، اس کی فطرت کا بھی یہی حال ہوگا۔ اگر وہ اپنے اعمال کے اندر نیکی اور بدی اور عظمت وذلت دونوں رکھتا ہے، تو اس کی فطرت کے اندر بھی نیکی وبدی اور فوز وخسران ہوں گے۔ اگر وہ اپنے اعمال اور نتائج اعمال کے اندر عظمت کا تخت اور ذلت کی بندگی دونوں جلوے دکھلاتا ہے، تو اپنی فطرت کے اندر بھی طاقت

وتسلط اور مقہوریت ومخذولیت، دونوں رکھتا ہوگا۔

اس نے اعمال کو دیکھ کر فطرت کے لیے حکم لگانا چاہا اور اس نے افراد کی حالت کو دیکھ کر نوع کے لیے فیصلہ کر دیا۔

اس غلطی نے اس کے اندر یہ عقیدہ پیدا کیا کہ ہم صرف بڑائی اور نیکی ہی کے لیے نہیں ہیں جیسا کہ بعض افراد نظر آتے ہیں، بلکہ حقیر ہونے اور برے رہنے کے لیے بھی ہیں جس طرح کہ اکثر افراد شہادت دیتے ہیں۔ پس نیکی اور برائی دونوں کے لیے اس میں ایک مایوس قناعت پیدا ہوگئی اور اس غیر صالح قناعت نے عزم اور ہمت کی پیاس کو بالکل بجھا دیا۔ ایک غلام ساری عمر غلامی اور بندگی میں خوش خوش گزار دیتا ہے اور کبھی اس کے اندر یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ میں بھی ویسا ہی انسان ہوں جیسا میرا آقا۔ پھر میں کیوں صرف بندگی کے لیے ہوں اور یہ کیوں آقائی کے لیے؟ ایک محکوم قوم ویسی ہی خوشی اور سکھ کے ساتھ غلامی کی خاک پر لوٹتی ہے، جس طرح ایک حاکم قوم عزت وعظمت کے تخت پر فرمانروائی کرتی ہے اور کبھی اس کے اندر یہ بیقراری نہیں اٹھتی کہ ہم بھی انسان ہیں، ہمارے پاس بھی وہ سب کچھ ہے جو ان حاکموں کے پاس ہے، پھر ہم کیوں ذلت کے لیے ہیں اور یہ کیوں عظمت وفرمانروائی کے لیے؟ ہزاروں مزدور ہیں جو کارخانوں میں پھرکیوں کی طرح چکر کھاتے ہیں اور اس میں اتنے ہی خوش ہوتے ہیں جس قدر کارخانہ کا مالک۔ لیکن کبھی ان میں یہ تڑپ نہیں اٹھتی کہ اگر ہم بھی چاہیں تو کارخانہ کے مزدور کی جگہ کارخانے کے مالک بن سکتے ہیں اور یہ کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کے انسان ہمارے مالک بن گئے؟ پھر اسی طرح دیکھو کہ ہزارہا انسان ہیں جو طرح طرح کی بدیوں اور خباثتوں کی گندگیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، مگر کبھی نہیں سوچتے کہ نیک وپاک انسان بھی آخر ہماری ہی طرح انسان ہیں۔ یہ کیوں ہے کہ وہ نیک ہیں مگر ہم نیکی کے لیے جنبش نہیں کر سکتے؟

ہر طرح کی مثالیں سامنے لاؤ اور ادنیٰ واعلیٰ حالتوں کے اختلاف کے جس قدر پہلو

ہو سکتے ہیں، ان سب پر نظر ڈالو۔ تم پاؤ گے کہ پستی وذلت اور بدی وشرارت کی ہر زندگی کے اندر ایک باطل قناعت اور قاتل بے حسی پیدا ہوگئی ہے اور یہی قناعت و بے حسی قوتوں کو پامال اور انسانیت اعلیٰ کی تمام بڑی سے بڑی طاقتوں کو ضائع کر رہی ہے۔

اب غور کرو کہ یہ حالت کیوں پیدا ہوئی؟ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا کہ چونکہ انسان کے اعمال اور اس کے ثمرات متضاد اور مخلوط ہیں اور اکثر حالتوں میں پستی و ناکامی کے نمونے زیادہ اور عظمت و کامرانی کے امثال کم ہیں، اس لیے ہر نامرادی کی حالت میں انسان نے نامرادوں پر نظر ڈالی اور ہر برائی کی زندگی میں اس نے بروں کو دیکھا۔ یعنی نامرادوں کو دیکھ کر اپنی نامرادی پر، گرے ہوؤں کو دیکھ کر اپنی گری ہوئی حالت پر، بروں کو دیکھ کر اپنی برائیوں پر، وہ ایک طرح کا استدلال کرنے لگا اور ان سے شہادت لا کر اپنی حالت کو فطری اور لابدی سمجھنے لگا۔ اس غلط استشہاد نے اس کے اندر غلط قناعت پیدا کی، اس کے احساس کو فنا کر دیا، اس کی طلب بجھ گئی اور وہ اپنی ذلت و برائی کو اصلی اور شدنی چیز سمجھ کر ایک بناوٹی خوش حالی میں مبتلا ہوگیا۔ غلام کے اندر آقا بننے کا کیوں جوش نہیں اٹھتا، اس لیے کہ وہ اپنے جیسے غلاموں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ صرف میرے ہی لیے نہیں ہے بلکہ سب کے لیے ہے اور اس لیے یہ ایک قدرتی چیز ہے جس پر صرف صبر ہی کر لینا چاہیے۔ پس اس نے غلاموں پر نظر ڈالی اور غلاموں سے اپنی غلامی پر شہادت لایا۔ اگر وہ غلاموں کی جگہ آقاؤں کو دیکھتا اور ان سے شہادت لیتا کہ آخر وہ بھی تو انسان ہی ہیں اور اسی کرۂ ارضی کی پیٹھ پر بستے ہیں، تو فوراً اس کا احساس مردہ زندہ ہو جاتا اور اپنی فطرت کے شرف خیریت کو پالیتا۔ ایک مزدور کیوں اسی میں خوش ہے کہ اٹھارہ گھنٹے کی محنت کے معاوضہ میں صرف ایک روٹی پائے؟ اس لیے کہ وہ اپنی ادنیٰ حالت کے لیے اپنے ہی جیسی ادنیٰ حالت کے مزدوروں کو دیکھتا اور ان سے استشہاد کرتا ہے۔ اگر وہ ان

سے جہاد کرتا جن کی وہ مزدوری کرتا ہے تو اس کے اندر بھی ولولہ عزم وطلب پیدا ہوتا ہے۔ ایک بد انسان کس طرح برائی میں اپنے اندر تسکین وقناعت پیدا کر لیتا ہے؟ اس لیے کہ وہ بروں ہی کو دیکھتا ہے اور انہی سے استشہاد کر کے سمجھ لیتا ہے کہ انسان اس لیے بھی بنایا گیا ہے کہ برائی کرے جیسا کہ سب کر رہے ہیں اور جب سب کر رہے ہیں تو وہاں ایک اور سہی:

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نشود
ز زہد ہم چو توئی یا بہ فسق ہم چومنی

پس حاصل مبحث یہ ہے کہ انسان نے فطرت انسانی کی حقیقت وخیریت کے سمجھنے میں غلطی کی اس لیے کہ اس نے:

۱- اعمال انسانی کو خیر وشر اور عظمت وذلت کا مجموعہ دیکھا۔
۲- پس وہ سمجھا کہ انسان کی فطرت میں بھی خیر وشر اور ذلت وعظمت دونوں ہیں۔
۳- اس نے اعمال کی راہ سے فطرت کو دیکھنا چاہا اور افراد کی حالت کو دیکھ کر نوع کو بھی اسی پر قیاس کر لیا۔
۴- اسی اعتقاد کا اثر اس کے تمام اعمال حیات میں پڑا۔ جب اس نے انسانی فطرت کو خیر وشر کا مجموعہ سمجھ لیا تو اس کے اندر شر وتسفل کی حالت میں ایک گمراہ قناعت پیدا ہوگئی۔ وہ سمجھنے لگا کہ جب برائی فطرت ہی میں ہے تو نیکی کا نہ ہونا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر افسوس کیا جائے اور جس کے لیے اچنبھا ہو۔

اس کی یہ حالت دراصل ایک استشہاد واستدلال ہے جو وہ تمام ادنیٰ وسافل حالتوں کے افراد سے کرتا اور عموماً شر وتسفل کو اپنے سامنے لاتا ہے۔

سورۂ والتین کے مطالب کی ترتیب

سورۂ والتین کا موضوع اور مسئلہ خیر و شر فطرت کے متعلق انسان کی غلطی کے اصلی اسباب معلوم ہو گئے۔ اب دیکھو کہ سورۂ والتین نے اس حقیقت کے اظہار و ثبوت کے لیے مطالب کی ترتیب کیا اختیار کی ہے؟

۱۔ اس نے دعویٰ کیا کہ انسان کی فطرت ہم نے نیک و صالح پیدا کی ہے۔ وہ صرف شرف و عظمت کے لیے ہے۔ اس کو بہترین حالت عدل پر ہم نے پیدا کیا ہے اور عدل ہی خیر کی حقیقت ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ (۹۵:۴)

۲۔ ساتھ ہی اس نے اس غلطی کا ازالہ کیا۔ جس کی وجہ سے انسان نے اپنی فطرت کے متعلق ایسی عظیم الشان غلطی کی۔ اس کی بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ انسان کی فطرت کے معلوم کرنے کے لیے انسان کے اعمال کو دیکھتا ہے اور برے انسانوں کو دیکھ کر فطرت کی برائی پر استشہاد کرتا ہے......... پس سورۂ والتین نے انسانی اعمال کی عظمت و جبروت کے لیے انسان کی عظمت و شرف سے استشہاد کیا اور یہ کہا کہ تم گرے ہوؤں کو دیکھ کر اپنی فطرت کو کیوں گرا ہوا سمجھتے ہو؟ ان کو نہیں دیکھتے جو گرنے کی جگہ بلند ہوئے؟ یہ لوگ فطرت صادقہ کو قائم رکھ کر بلند ہوئے۔ وہی لوگ ہیں جن کی طرف وَالتِّیْنِ وَ الزَّیْتُوْنِ وَ طُوْرِ سِیْنِیْنَ وَ ھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ (۹۵:۱۔۳) کے تین جملوں میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہی وہ انعام یافتہ الٰہی گروہ ہیں جن کی راہ صراط مستقیم ہے اور جن کی راہ کی طلب سورۂ فاتحہ میں سکھلائی گئی ہے:

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ (۱:۷)

ان کی راہ جن پر خدا نے انعام کیا۔

یہی حزب اللہ ہیں ، یہی اولیاء اللہ ہیں، یہی خیر البریہ ہیں ، یہی البصیر ہیں اور یہی اصحاب الجنتہ ہیں۔

۳- رہا اعمال انسانی کی بوقلمونی اور خیر و شر کا سوال تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ انسان کی فطرت برائی ہے۔اس کی فطرت تو عدل و خیر ہی ہے، البتہ وہ جب اس کو ضائع کر دیتا ہے اور اعمال سافلہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو جس طرح اس کی خلقت سب سے اعلیٰ تھی ، اسی طرح اس کا اکتساب عمل اس کو سب سے زیادہ ادنیٰ بھی بنا دیتا ہے۔حتیٰ کہ اپنی حقیقت انسانی کو مسخ کر کے بسا اوقات چار پایوں اور درندوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔تم یہ حالت مسخ دیکھ کر کہتے ہو کہ یہ فطرت ہے، مگر نہیں سمجھتے کہ فطرت نہیں خارج کا کسب و عمل ہے۔پس اعمال انسانی میں خیر و شر اور عظمت و تسفل جو تمہیں نظر آتا ہے، اس میں تفریق کرو۔نیکی و عظمت اس کی خلقت ہے اور شر و تسفل اس کی ضلالت عمل اور ضیاع فطرت۔یہ اس کا عمل ہی ہے جس نے اسے چار پایوں سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ۔(۹۵:۵) اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ یعنی ادنیٰ سے بھی ادنیٰ تر حالت تک گرے ہوئے وہی ہیں جن کا نام مغضوب اور ضالین ہے۔ پھر: حزب الشیطان ، اولیا الطاغوت ، شرالبریہ ، الاعمیٰ اور اصحاب النار بھی وہی ہیں۔

۴- یہ غلطی اس لیے ہے کہ تم اللہ کے قانون جزاو مکافات سے بے خبر ہو۔اس کا قانون ہے کہ ہر بیج پھل لاتا ہے اور اسی طرح انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔زہر جب کھایا جائے گا انسان مرے گا اور معصیت جب کبھی کی جائے گی عذاب آئے گا۔پس اعمال کی جزا ہی سے تمام نتائج پیدا ہوتے ہیں۔اگر تمہارے اعمال فطرت صالحہ یعنی دین الٰہی کے مطابق ہیں اور تم نے اس کو ضائع نہیں کیا ہے، تو تم اپنی فطری بڑائی اور نیکی حاصل کرو گے۔اگر تم نے ضائع کر دیا تو پھر تم مسخ ہو جاؤ گے اور تم سے برا جانور زمین کی پیٹھ پر اور کوئی نہ ہو گا۔جانور نے اپنی اصلی فطرت کو ضائع نہیں کیا وہ

سافل ہے۔ تم نے اپنی فطرت ہی کو ضائع کر دیا۔ پس تم سافلوں سے بھی اسفل اور بد سے بھی بدتر ہو گئے!

۵- پس جن لوگوں نے اپنی فطرت کو عمل غیر صالح سے ضائع کر دیا وہ انسانیت سے گر گئے، مگر جنہوں نے ایمان باللہ سے انکار نہ کیا اور ایسے اعمال اختیار کئے جو صالح ہیں اور اس لیے نور فطرت کو قائم رکھنے والے اور چمکانے والے ہیں، سو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب انسانیہ تک فائز ہوئے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ اس دوسری جماعت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے عمل صالحہ کا درخت ہمیشہ پھل دے گا۔ ان کے نتائج حقہ کی برکتیں اور نعمتیں بھی ختم نہ ہوں گی۔ وہ اسفل سافلین کی حالت میں نہ ہوں گے کہ فنا اور ہلاکت ان پر طاری ہو۔ وہ ''شجر خبیثہ'' نہیں ہیں، ''شجر طیبہ'' ہیں۔ لہٰذا فرمایا:

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۔

اصل تفسیر

اب اصل سورت کی یک جا تلاوت کرو:

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝ (۹۵:۱۔۸)

انجیر اور زیتون، طور سینا اور مکہ معظمہ شاہد ہیں کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین حالتِ عدل پر پیدا کیا۔ پھر اس کو بد سے بدتر حالت میں پھینک دیا۔ مگر وہ لوگ کہ ایمان لائے اور عمل صالح کیے تو ان کے اعمال کے نتائج صرف بہتری ہی کے لیے ہیں۔ ان کے عمل صالح کا بدلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ ہمیشہ پھل دے گا۔ پس اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد کون ہے جو اعمال کے نتائج سے انکار کرے گا اور اس بارے میں رسول ﷺ کی تعلیم کو جھٹلائے گا؟ کیا سب سے بڑا حکم کرنے والا خدا ہی نہیں ہے؟ جس کے قانون جزا و سزا میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

تفصیل استشہاد

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد دین الٰہی کا سلسلہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور ظہور اسلام اسی کا آخری مکمل ظہور ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے بنو اسرائیل پیدا ہوئے جن کے احیاء کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا ظہور ہوا اور انہوں نے بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے نکال کر عزت وخلافت کے درجہ پر پہنچا دیا۔ ان کے بعد جب بنی اسرائیل نے پھر اللہ کے احکام سے سرتابی کی اور اصلاح کی جگہ افساد کا طریق اختیار کیا تو روز بروز تنزل و تسفل میں مبتلا ہونے لگے۔ پس انبیائے مجددین کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ یکے بعد دیگرے اصلاح کرتے رہے۔ لیکن سلسلہ تنزل بھی برابر بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وراثت ارضی سے بنو اسرائیل محروم ہو گئے اور ان پر یکسر تباہی و بربادی طاری ہو گئی۔ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا ظہور ہوا۔ جن پر چند غریب اور فاقہ مست انسان ایمان لائے، لیکن اللہ نے انہی غریب مچھووں اور فقیروں کو یہ درجہ دیا کہ ان کی دعوت و تبلیغ عالم میں پھیلی اور تمام روم و یونان میں مسیحی مذہب پھیل گیا۔

پس انسان کے اعمال عظیمہ وصالحہ کے ان مظاہر کے تین قریبی درجے ہوئے:

ا- دین الٰہی کی وہ بنیاد جو بیابان حجاز میں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے ڈالی اور اس کی اینٹیں رکھتے ہوئے امت مسلمہ کے ظہور کی دعا مانگی:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔(۲:۱۲۸)

اور جب حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسماعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں رکھ رہے تھے، تو ان کی زبانوں پر یہ پاک دعا جاری تھی۔ اے پروردگار! ہمارے اس کام کو قبول کر لے تو دعاؤں کا سننے والا ہے اور تو ہماری نیتوں کو خوب جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول کیا۔ نسل اسماعیلی سے امت مسلمہ کا ظہور ہوا اور وہ آخری معلم ربانی آ گیا جس نے تعلیم کتاب و حکمت اور تربیت و تزکیۂ الٰہی سے جماعت مومنین پیدا کر دی۔

دعوت موسوی کی وہ روشنی جو طور سینا پر چمکی اور وادی ایمن کے بقعۂ مبارکہ سے اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۸:۳۰) کی صدائے حق اٹھی:

فَلَمَّاۤ اَتٰهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیِٴ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔(۲۸:۳۰)

پس جب موسیٰ کوہ طور کے پاس پہنچے تو وادی ایمن کے کنارے کہ زمین کا ایک مبارک حصہ تھا، درخت سے ندا اٹھی: اے موسیٰ میں تمام جہانوں کا پروردگار ہوں!

یہی کوہ طور کی وادی ایمن کی روشنی تھی جس نے بنو اسرائیل کو ظلمت تنزل و تسفل سے نجات دلائی اور عظمت و خلافت الٰہی کے درجے تک مرتفع کیا:

۳ : دعوت مسیحی کا وہ ظہور جو سلسلہ اسرائیلی کا آخری ظہور تھا اور جو بیت المقدس کی سر زمین میں ہوا:

فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ۔(۶۱:۱۴)

پس بنو اسرائیل کی ایک جماعت اس پر ایمان لائی اور ایک جماعت نے انکار کیا۔ مومنوں کو ہم نے ان کے دشمنوں کے مقابلے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان والوں کی کامیابی اور فتح مندی ظاہر ہو گئی۔

قرآن حکیم کی مخاطب جو جماعتیں تھیں، ان کی معلومات میں بھی انسانی عظمت و قدوسیت کے بالاتفاق یہی تین جلوے تھے۔ اہل کتاب حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا تھے اور مشرکین مکہ کا بڑا ادعائی شرف یہ تھا کہ اپنے تیئں حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کریں۔

پس سورۂ والتین میں سعادت انسانی کے انہی تین ظہوروں سے انسان کی فطرت صالحہ وعظمت وشرف پر شہادت دلائی گئی۔ تین اور زیتون سے مقصود سرزمین شام ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا اور جو تمام انبیاء مجددین اسرائیل کا مقام ظہور ہے۔ طور سینین سے اشارہ دعوت موسوی کی طرف ہے جس کی تجلی کا مطلع اسی مقدس پہاڑ کا دامن تھا۔ ''بلد امین'' یعنی ہمیشہ امن میں رہنے والا گھر خانہ کعبہ ہے اور اس میں اشارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت موسسہ ابراہیمیہ اور اس کے نتائج کی طرف ہے۔

استشہاد کی ترتیب شاخ سے اصل کی طرف، نسل سے مورث کی طرف، فاضل سے افضل کی طرف اور حسن سے احسن کی طرف ہے۔ یعنی ظہور سعادت انسانی کے اس سلسلہ میں افضل ترین بنیادی مرتبہ دعوت ابراہیمی کا ہے۔ اس کے بعد مرتبہ قیام شریعت موسوی کا۔ اس کے بعد مرتبہ تجدید انبیاء بنی اسرائیل کا عموماً اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصا (علیٰ نبینا و علیھم الصلوٰۃ و السلام) پس ترتیب جڑ سے شاخ کی طرف نہیں ہے، بلکہ شاخ سے جڑ کی طرف ہے اور اس میں بالترتیب تینوں درجوں کے مراتب یکے بعد دیگرے ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ چونکہ سب سے آخری ظہور مسیحی سب سے زیادہ قریب تھا، اس لیے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد اس سے اعلیٰ مرتبہ دعوت موسوی کا تھا، پس اس کا ذکر کیا۔ پھر سب سے اعلیٰ ترین مرتبہ بمنزلہ اصل وحقیقت الحقائق کے مقام خلت کبریٰ حضرت ابراہیمؑ کا تھا۔ پس اس پر مدارج ثلاثہ ختم ہو گئے۔

تین و زیتون

''تین وزیتون'' سے سرزمین شام کا مراد لینا بالکل واضح ہے:

۱- ''طور سینین'' اور ''بلد امین'' دونوں میں اشارہ اس سرزمین کی طرف کیا گیا ہے جہاں ان کی دعوتوں کا ظہور ہوا۔ پس معلوم ہوا کہ اس سورۃ میں سرزمین کی طرف اشارہ کر کے اس سرزمین کی مشہور دعوت وامت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اس بنا پر ''تین و زیتون'' میں بھی اشارہ کسی سرزمین ہی کی طرف ہوگا۔ جیسا کہ مابعد کی دوشہادتوں میں ہے۔

۲- دنیا کی تمام سرزمینوں میں اس وقت بھی جب کہ قرآن حکیم نازل ہوا اور اب بھی جب کہ ملکوں کی طبعی پیداوار کی فہرست ہمارے سامنے موجود ہے۔ انجیر اور زیتون ایک مخصوص پیداوار سرزمین شام کی ہے۔ جس کثرت کے ساتھ اور جس قدر اعلیٰ درجہ کی یہ دونوں چیزیں وہاں ہوتی ہیں، کہیں نہیں ہوتیں۔ زیتون کا تیل شام کی عام غذا ہے۔ گھی کی جگہ عام طور پر اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی اعمال کا اب تک یہ ایک مقدس جزو ہے۔ ان کے تمام مذہبی رسوم میں اسی تیل کو ''مقدس تیل'' کہا جاتا ہے۔ روم کے تمام عیسائی بادشاہ جب تخت نشین ہوتے تھے، تو مقدس تیل ان کے سینے پر لگایا جاتا تھا اور کہتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اتباع ہے۔ آج تک تاج پوشی کی رسم میں ایک پیالی روغن زیتون کی بھی رکھی جاتی ہے۔ قطع نظر ان تمام خصوصیات کے، اس سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ تمام عرب میں یہ دو چیزیں شام کی مخصوص وممتاز پیداوار سمجھی جاتی تھیں اور اس قدر مشہور تھیں کہ بچہ بچہ جانتا تھا۔ اشارہ کے لیے یہ کافی ہے۔

پس جب تین وزیتون کا اشارہ بھی کسی ملک کی طرف ہونا چاہیے اور وہ شام کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ تو پھر یہ ظاہر ہے کہ شام کا سب سے بڑا آخری ظہور حق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہے اور ساتھ ہی یہ سرزمین تمام اسرائیلی انبیاء مجددین کے ظہور کا بھی گھر ہے۔

نیز چونکہ اس کے بعد ہی دعوت موسوی کی طرف اشارہ موجود ہے، اس لیے ربط بھی یہی چاہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی طرف بھی اشارہ ہو۔

۴۔ سب سے زیادہ یہ کہ تین اور زیتون کی تفسیر کے متعلق صحابہ کرام و تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جو روایات موجود ہیں، ان سب پر مجموعی نظر ڈالنے کے بعد یہی تفسیر مرجع ثابت ہوتی ہے اور قرآن حکیم کی سب سے زیادہ صحیح تفسیر وہی ہے جو صحابہ کی تفسیر سے مطابق ہو کہ ان کے علوم حامل وحی سے براہ راست ماخوذ تھے۔

امام ابن جریر طبری نے تمام روایتیں جمع کر دی ہیں۔ ان پر نظر ڈالو۔ سب سے پہلے حضرت کعبؓ کا ایک قول سامنے آتا ہے کہ:

التین مسجد دمشق و الزیتون بیت المقدس

تین مسجد دمشق ہے اور زیتون بیت المقدس

پھر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی نسبت سے اس قول کی شہرت ثابت ہوتی ہے کہ:

الزیتون بیت المقدس

یعنی زیتون بیت المقدس ہے

لیکن اس کے بعد بعض کبار تابعین کی تصریحات آتی ہیں جنہوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ: "ھو تینکم و زیتونکم "یعنی تین اور زیتون سے یہی انجیر اور زیتون مراد ہے جو تم استعمال کرتے ہو اور کوئی چیز مقصود نہیں ہے۔ حضرت حسنؒ، عکرمہؓ، مجاھدؒ، قتادہؒ وغیرہ سب نے یہی کہا ہے۔

اب ان دونوں تفسیروں کو جمع کرو۔ جن صحابہ سے اس قول کی شہرت ہوئی کہ تین اور

زیتون سے مراد مسجد دمشق اور بیت المقدس ہے، ان کا مقصود یہ نہ تھا کہ دمشق کی کسی عمارت کا نام تین ہے اور بیت المقدس کا نام زیتون، بلکہ یہ واضح کرنا تھا کہ تین و زیتون میں اشارہ سرزمین شام کی طرف ہے، کیونکہ وہاں ان دو چیزوں کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے اور یہ اس کے خصائص میں سے ہیں۔ پس زیتون یعنی بیت المقدس سے مطلب یہ تھا کہ زیتون میں اشارہ بیت المقدس کی طرف ہے۔

لیکن بہت سے لوگوں کو اس میں غلطی ہوئی اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ طور سینا کی طرح زیتون بھی بیت المقدس کے کسی پہاڑ کا نام ہے اور پھر طرح طرح کی مزید تاویلیں اس میں بڑھ گئیں۔ یہ حال دیکھ کر بعض اجلہ تابعین نے غلطی کو دور کرنا چاہا اور زور دے کر کہا کہ: "هو تينكم و زيتونكم" تین اور زیتون کسی پہاڑ یا ملک کا نام نہیں ہے۔ وہ یہی انجیر و زیتون کا درخت ہے جو تم استعمال کرتے ہو۔ گویا انہوں نے واضح کیا کہ تین و زیتون سے اس کی جائے پیدائش مقصود ہے۔ یہ نہیں کہ خود اس سرزمین کا نام ہی تین و زیتون ہو۔

چنانچہ امام ابن جریر کا بھی قریب قریب یہی خیال ہے۔ تمام روایتیں جمع کر کے لکھتے ہیں:

والصواب من القول فی ذالك عندنا من قال التين هو التين الذی يوكل والزيتون هو الزيتون الذی يعصر منه الزيت لان ذالك هو المعروف عند العرب ۔ الا ان يقول قائل اقسم ربنا بالتين و الزيتون و المراد من الكلام القسم بمنابت التين و منابت الزيتون فيكون ذالك مذهبا (جلد۳: ۱۵۴)

اس بارے میں ہمارے نزدیک انہی لوگوں کا قول ٹھیک ہے جنہوں نے کہا کہ تین وہی تین ہے جو کھایا جاتا ہے اور زیتون وہی درخت ہے جس سے تیل نکلتا ہے کیونکہ عرب میں یہ معروف تھا اور اس نام کے کسی پہاڑ کو وہ نہیں جانتے تھے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کہے کہ اللہ نے تین اور زیتون کی قسم کھائی مگر مقصود اس سے تین و زیتون کے

پیدائش کے مقامات کی قسم کھانا ہے۔ سو اگر یہ کہا جائے تو یہ ایک مذہب ہوگا۔
اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ زیتون سے یہی پھل اور درخت مراد لیتے ہیں، ان کو صرف اس سے انکار ہے کہ کسی ملک یا پہاڑ کا نام تین وزیتون نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے لیکن اس سے وہ انکار نہیں کرتے۔ کہ ان چیزوں سے ان چیزوں کی پیدائش کی سرزمین مراد نہ ہو۔

احسن تقویم

"احسن تقویم" میں "تقویم" ٹھیک ٹھیک بمعنی تعدیل کے ہے۔ یعنی ہم نے انسان کو بہترین قوام وعدل پر پیدا کیا۔ تعدیل خلقت میں جسم اور فطرت ظاہر و باطن سب داخل ہیں اور جن صحابہ و تابعین سے "فی اعدل خلق و احسن صورۃ" بکثرت منقول ہے اور نیز جو صحابہ استقامت صورت وجسم کو پیش کر کے حقیقت تعدیل خلقت کو سمجھانا چاہتے ہیں، ان سب کا مقصود یہی تعدیل فطرت ہے اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ کسی نے کہا کہ انسان کا قد دیکھو، کسی نے کہا جسم کا تناسب دیکھو، کوئی اور آگے بڑھا اور کہا کہ خلقت کی تعدیل معنوی پر بھی نظر ڈالو۔ تعدیل کا ایک بڑا نمونہ انسان کا قد ہے۔ اس کی بڑی نمود اس کے تناسب اعضاء وجسم میں ہے اور پھر اس کی فطرت عدل و قوام صالح پر پیدا کی گئی ہے۔ پس سب نے ایک ہی حقیقت کو واضح کیا اور اسی کو مختلف تعبیرات سے سمجھانا چاہا۔

سورة القدر

إِنَّا أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ ٥ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ ٥ لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ٥ تَنَزَّلُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَٱلرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ٥ سَلَٰمٌ هِىَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ ٱلْفَجْرِ ٥ (۹۷: ۱-۵)

ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں اتارا۔ اور تم سمجھے کہ لیلۃ القدر کیا شے ہے؟ لیلۃ القدر ایک عہد رحمت و دور برکت ہے جو ہزاروں مہینوں سے افضل ہے۔ ملائکہ سماوی و روح الٰہی کا اس میں ہر طرف سے نزول ہوتا ہے۔ سلام اس پر یہاں تک کہ صبح طلوع ہو جائے۔

عالم تقدیر خاموش نہیں ہے۔ وہ ایک امام ناطق ہے۔ اس نے مجموعی طور پر تمام عالم کی قسمت کا فیصلہ ازل ہی میں کر دیا تھا، لیکن اشخاص و اقوام کی تقدیر کا فیصلہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔

کارکنان قضا و قدر بہت سی قوموں کی قسمت کا فیصلہ کر چکے تھے، مگر ایک بادیہ نشین قوم پہاڑوں کے دامن میں دبی پڑی تھی۔ انہی پہاڑوں کے غار سے آتشیں شریعت کا ایک شرارہ اڑا اور دفعۃً خرمن جہل و ضلالت پر برق خاطف بن کر گرا۔ اس مردہ قوم کی سوئی ہوئی تقدیر نے مدت کے بعد ایک خاص رات میں کروٹ بدلی۔ اس لیے اس رات کو لیلۃ القدر

کہا گیا، کیونکہ اسی رات میں اس کے کارنامہ اعمال کو قرآن حکیم کے ذریعہ سے معین ومقدر کر دیا گیا تھا:

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷:۱)

ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا [۳]

لیلة القدر: قیل لیلة الشرف و الفضل و قیل لیلة التدبیر و التقدیر و هو اقرب (احکام القرآن لابن عربی)

عربی زبان میں متکلم کے لیے ''انی'' و ''انا'' کی دو ضمیریں ہیں جو بہ ترتیب ''واحد متکلم'' و ''جمع متکلم'' کے لیے مستعمل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا کی نشاۃ اولیٰ کا موسس بنانا چاہا تو فرمایا:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲:۳۰)

میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے معمولی صیغہ واحد متکلم کا استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اشیاء و امثال کا پیدا کرنا اس کی قدرت کاملہ کے نزدیک کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن بطون ارواح کی نشاۃ جدید دنیا کے لیے مایہ صد رحمت و برکت تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب کسی پیغمبر کو اس نشاۃ حقیقیہ کا ذریعہ بنایا ہے تو اس موقع پر اپنے لیے ضمیر جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے جو واحد کے لیے تعظیم و شرف کا پہلو رکھتا ہے۔ یہ تعظیم درحقیقت اس جدید روح سعادت و ہدایت کی اہمیت و عظمت کو نمایاں کرتی ہے جو دنیا میں ظہور پذیر ہونا چاہتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے دنیا کا قالب موزوں تیار کر دیا تھا لیکن وہ روح سے یعنی ترقی یافتہ دین الٰہی کی حقیقی روح سے خالی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ امانت دے کر دنیا کی طرف بھیجا جو ایک عظیم الشان روحانی انقلاب تھا۔ پس ضمیر

تعظیمی سے اس کا اظہار کیا:

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحاً (۱:۷۱)

ہم نے نوح کو بھیجا

لیکن یہ روح امتداد زمانہ سے فرسودہ ہوگئی تھی بلکہ سچ یہ ہے کہ بالکل مردہ ہوگئی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعہ اس روح مردہ کو، اس گل پژمردہ کو، اس بخت خفتہ کو پھر زندہ کیا، شگفتہ کیا، بیدار کیا۔ یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا۔ جس نے نقشہ عالم کو یکسر پلٹ دیا تھا۔ پس ہمیشہ اس کی اہمیت بھی ضمیر تعظیمی کے پردے میں نمایاں کی گئی۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ۔ (۹:۱۵)

ہمیں ہیں کہ ہم نے اپنے ذکر کو نازل کیا

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ۔ (۱:۹۷)

ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا

اسی کتاب ذوالخطر والبال کو خدا نے ''کوثر'' بھی کہا ہے کہ وہ مایہ خیر کثیر ہے۔

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ

ہم نے تم کو کوثر یعنی قرآن عطا فرمایا

یہاں بھی قرآن کا ذکر متکلم جمع تعظیمی سے کیا۔

اسی کے ذریعہ دینِ ابراہیمی زندہ ہوا ہے۔ اس لیے اس تیغ خیر کے عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی سب سے بڑی یادگار قربانی کے قائم کرنے کا حکم دیا:

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ۔ (۲:۱۰۸)

تو اپنے خدا کی نماز پڑھ اور قربانی کر

اللہ تعالیٰ نے اسی دین کے ذریعہ ابراہیم علیہ السلام کی یادگار اور ذکر عظیم کو قائم رکھا:

وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا۔ (۵۰:۱۹)

اور ہم نے ان کے ذکر خیر کو رفعت و بلندی عطا کی

آنحضرت ﷺ کا ذکر جمیل بھی اسی کی برکت سے غلغلہ انداز عالم روح و ایمان ہے۔ "وَرَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ" اسی لیے ان دونوں مقامات میں بھی جمع متکلم کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

مذہب کی پاک روح مردہ ہوگئی تھی، لیکن اس رات میں اعادہ معدوم اور حیات بعد الممات ہوا وہ کتمِ عدم سے عالمِ شہود میں اتری۔

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۔(۴:۱۰۸)

اس رات میں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں

فرشتے اور روح اس رات میں اترتے ہیں، مگر بتدریج پورے ایک مہینے میں اترتے ہیں کیونکہ دنیا کا دامن دفعتہ ان برکات وفضائل کے سمیٹنے کی وسعت نہیں رکھتا:

داماں نگہ تنگ ، گل حسن تو بسیار
گل چیں نگاہ تو زداماں گلہ دارد

لیکن یہ ملائکہ کیا ہیں؟ اور اس روح کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے خود اس آیت میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے: مِّن كُلِّ أَمْرٍ سَلٰمٌ یعنی وہ ملائکہ اور روح امن اور سلامتی ہیں، جو دنیا کو یکسر امنیت وسلامتی کی برکتوں سے معمور کر دیتے ہیں!

یہ سکون، یہ اطمینان کامل، یہ سلامتی، یہ امن عام جو ہم پر آسمان سے اترا صرف عرب کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ وہ مشرق و مغرب دونوں کو محیط ہے۔ ہمارا آفتاب اگرچہ مغرب سے طلوع ہوا تھا جو ہمارا قبلہ ایمان ہے۔ لیکن اس کی شعاعوں نے مشرق کے افق کو بھی روشن کر دیا جہاں سے دنیا کا سورج نکلتا ہے اور جہاں سے صبح کا ستارہ طلوع ہوتا ہے:

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ٥(۵:۹۷)

وہ امن وامان کا پیغام صبح کے طلوع ہونے کی جگہ تک یعنی مشرق تک پہنچ جائے گا؟

قرآن حکیم نے دوسری آیتوں کے ذریعہ اس نکتہ کو حل کر دیا ہے:

اِنَّـا اَنۡزَلۡنٰـهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ ۔فِیۡهَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ۔ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ۔ رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ اِنَّه هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (۴۴:۳۔۶)

ہم نے قرآن کو ایک مبارک رات میں اتارا کیونکہ ہم دنیا کو اس کی ضلالت کے نتائج سے ڈرانے والے تھے۔ تمام انتظامات الٰہیہ جو حکمت و مصلحت عالم پر مبنی ہیں، اسی رات میں طے پاتے ہیں۔ ازاں جملہ قرآن کا نزول جو اسی رات میں شروع ہوا نیز ہمیں اپنا رسول ﷺ بھیجنا مقصود تھا، جس کا ظہور اللہ کی رحمت کا نزول ہے۔

اب ان دونوں سورتوں کے تطابق و تشاکل پر غور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ قدر میں فرمایا "اِنَّـا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ" اور یہاں فرمایا "اِنَّـا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ" اسی لیے یہ دونوں راتیں ایک ہی ہیں۔ وہاں فرمایا تھا: تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوۡحُ فِیۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ مِّنۡ کُلِّ اَمۡرٍ سَلٰمٌ اور یہاں فرمایا: فِیۡهَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ۔ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا اس بنا پر یہ "اَمۡرٍ سَلٰمٌ" اور "اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ" جس کی تنزیل و تقسیم لیلۃ القدر میں خدا کے حکم سے کی گئی ہے، دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خود وہ "اَمۡرٍ سَلٰمٌ" اور "اَلۡاَمۡرِ حَکِیۡمٍ" کیا چیز ہے؟ دوسری آیتوں نے اس کی تفسیر کر دی ہے:

الٓرٰ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ۔ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَهُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؟(۱۰:۱۔۲)

یہ قرآن حکیم کی آیات ہیں۔ پھر کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک آدمی پر وحی کی تا کہ وہ لوگوں کو ڈرائے اور مومنوں کو اس بات کا مژدہ سنائے کہ خدا کے تخت کے نیچے ان کا قدم جم گیا ہے؟

اس لیے یہ "امر حکیم" اور یہ "امر سلام" خود قرآن کریم ہے جو لَيْلَةِ الْقَدْر میں نازل کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ قدر میں قرآن حکیم کی چند خصوصیات کا اجمالی ذکر فرمایا تھا، لیکن اس آیت میں وہ خصوصیتیں بہ تفصیل بیان فرمائی ہیں۔

سورۂ قدر میں فرمایا تھا کہ وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ تک پھیل جائے گا۔ یہ نہایت مجمل طرز خطاب تھا۔ سورۂ دخان میں اس کی تفسیر بھی کر دی:

"فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۔ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا" (۴:۴۴)

یعنی قرآن حکیم کی آیتیں ہمارے حکم سے ایک پیغمبر پر تقسیم کی جاتی ہیں تا کہ وہ دنیا کے سامنے ان آیتوں کو لے کے جائے اور ہر شخص کے آگے اس خوان کرم کو بچھا دے تا کہ ہر شخص اپنا حصہ لے لے:

" إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ۔ رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ" (۵:۴۴)

لیکن دنیا غفلت کی نیند میں سو رہی تھی۔ اس لیے یہ ابر رحمت پہلے گرجا تا کہ دنیا جاگ اٹھے۔ اس نے اپنی چادر غیب سے پہلے اس ہاتھ کو نکالا جس میں بجلی کا تازیانہ تھا۔

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ قُمْ فَأَنذِرْ ۔ (۷۴:۱۔۲)

او چادر اوڑھنے والے، اٹھ اور ڈرا

پہلے اس کو گرجنے اور تڑپنے کی ضرورت تھی، اس لیے وہ گرجا، چمکا، تڑپا:

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ۔(۴۴:۳)

لیکن درحقیقت اس کا یہ وصف عارضی تھا، ورنہ رفق و ملاطفت اس کا مایہ خمیر اور عنصر حقیقی ہے:

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔

(۱۲۸:۲)

اس لیے وہ روئی کے گالے سے بھی زیادہ نرم وسفید بادل کا ایک ٹکڑا تھا۔ جو آب شیریں کا خزانہ اپنے ساتھ رکھتا تھا، اگر چہ ابتدا میں بجلی کی کڑک اس کا مظہر ورود ہوئی۔ یہ انداز وعید، یہ قہر وغضب، اس قوم کی شامت اعمال کا نتیجہ تھی ورنہ پیغمبر امی ﷺ خدا کی طرف سے صرف بشارت رحمت اور لطف وکرم کا مجسمہ بنا کر بھیجا گیا:

"اِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ۔ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ" (۴۴:۵)۔

لیکن خدا کی یہ رحمت صرف عرب کے ساتھ خاص نہ تھی بلکہ اس ابر کرم نے تمام مشرق و مغرب کو جل تھل کر دیا۔ چنانچہ دوسری جگہ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ کی تفسیر کر دی گئی:

وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔(۲۱:۱۰۸)

ہم نے تجھ کو تمام دنیا کے لیے صرف رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا

لیلۃ القدر کو تمام راتوں پر صرف اسی لیے فضلیت نہیں ہے کہ اس میں عبادت کا ثواب تمام راتوں سے زیادہ ملتا ہے۔ بلکہ اس بنا پر بھی کہ اس میں ہم کو ایک کتاب دی گئی اور ہم کو مشرق ومغرب میں اس کی منادی کرنے کا حکم دیا گیا۔ بادشاہوں کی منادی طبل وعلم کے ساتھ کی جاتی ہے، لیکن خدا کی منادی تہلیل وتکبیر کے ساتھ ہونی چاہیے۔ رمضان کے بعد عید کا حکم اسی لیے دیا گیا تا کہ تہلیل وتکبیر کی مقدس صداؤں میں اسلام کے جاہ وجلال، نفوذ و قوت اور وسعت واثر کا سماں دنیا کو نظر آ جائے:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔(۲:۱۸۵)

پھر آہ تمہاری غفلت کیسی شدید اور تمہاری گمراہی کیسی ماتم انگیز ہے کہ تم "لَیْلَةِ الْقَدْر" کو تو ڈھونڈ ھتے ہو پر اس کو نہیں ڈھونڈ ھتے جو لَیْلَةِ الْقَدْر میں آیا اور جس کے ورود سے اس رات کی قدر ومنزلت بڑھی۔ اگر تم اسے پالو تو تمہارے لیے ہر رات لَیْلَةِ الْقَدْر ہے:

ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

سورۃ العصر

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (۱۰۳:۴)

قسم ہے اس عصر انقلاب اور دور تغیرات کی، جو پچھلے دور کو ختم کرتا اور نئے دور کی بنیاد رکھتا ہے، کہ نوع انسانی کے لیے دنیا میں نقصان و ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ہاں وہ نفوس قدسیہ، جو قوانین الٰہیہ پر ایمان لائے اعمال صالحہ اختیار کئے، ایک دوسرے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ سے دین حق کی وصیت کرتے رہے اور نیز صبر و استقامت کی بھی انہوں نے تعلیم دی۔

قرآن کا ہر اچھے مقصد کے لیے یہ اعلان ہے کہ اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے لئے، انسانوں کی تلاش کے لیے، جستجوؤں کے لیے اور امیدوں کے لیے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں، بڑے بڑے گھاٹے ٹوٹے ہیں۔ لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے کہ بچ سکتی ہے اور ناکامیابی کی جگہ کامیابی پا سکتی ہے۔ ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں آشیانہ بنا سکتی ہے، وہ کون انسان ہے؟ وہ انسان ہے، جو دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً و عملاً اپنے اندر پیدا کر لے۔ جب تک یہ پیدا نہ ہوں گی، اس

وقت تک دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہوسکتی ہے، نہ ملک، حتیٰ کہ ہوا میں اُڑنے والا پرندہ بھی دنیا میں کامیابی نہیں ہوسکتا۔

ان چار شرطوں کے نام سے گھبرا نہ جانا اگر ایک چیز عربی بھیس میں آجائے، تو کیا تم انکار کردو گے، چاہے وہ پہچانی ہوئی ہو؟

پہلی شرط وہ ہے جس کا نام قرآن مجید کی بولی میں ایمان ہے۔

"اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" ۔تم جبھی کامیابی پا سکتے ہو، جب تمہارے دلوں کے اندر، روح کے اندر، وہ چیز پیدا ہوجائے، جس کا نام قرآن مجید کی زبان میں ایمان ہے۔

ایمان کے معنی ہیں عربی میں زوال شک کے، جب تک کامل درجے کا بھروسہ اور کامل درجہ کا اقرار تمہارے دل میں پیدا ہو جائے۔ جب تک کامل درجہ کا یقین تمہارے دلوں کے اندر نہ پیدا ہو، اللہ کی صداقت پر، اللہ کی سچائی، پر اللہ کے اصولوں پر، جس وقت تک کامل درجے کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا، کامیابی کا کوئی دروازہ تمہارے لیے نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے، تو تمہیں کو اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔ تم کو کامیابی نہیں ہوسکتی۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ تمہارے اندر ایمان، اطمینان، یقین، جماؤ، تمکن اور اقرار پیدا ہو، لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا فعل، تصور کا یہ نقشہ کامیابی کو پورا کردے گا؟ نہیں

فرمایا: ایک دوسری منزل بھی اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کرلو گے، اس ایک منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پا سکتے۔ اس دوسری منزل یا شرط کا نام قرآن کی بولی میں "عمل صالح" ہے (وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) یعنی وہ کام جو اچھا ہے، اسے اچھائی کے ساتھ کیا جائے۔ جس کام کو جس صحت اور جس طریقہ کے ساتھ کرنا چاہیے، جو طریقہ اس کے لیے سچا طریقہ ہوسکتا ہے اس کام کو اس کے ساتھ انجام دینا۔

قرآن کا یہ اصول تو عام ہے۔ ایمان کے معنی ہیں، وہ یقین، وہ کامل اطمینان، وہ کامل اقرار، جو عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ چیز جو دماغ میں موجود تھی، وہ ارادہ جو دماغ میں پیدا ہوا تھا، وہ پہلی منزل ہوئی جو مذہب میں آ کر "ایمان" کا نام اختیار کر لیتی ہے پہلی چیز عمل دماغ ہے، عمل تصور و یقین ہے۔ اسی بنا پر سب سے پہلی منزل ایمان کی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر سچا ارادہ پیدا ہو، سچا عزم پیدا ہو۔ دوسری منزل یہ ہے (وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) کی ہے۔ صرف دماغ کی منزل طے کر کے قدم نہ رک جائیں بلکہ عمل بھی کرو وہ جو صالح ہو۔ جو صحیح طریقہ ہے اس کام کے انجام دینے کا۔ جب اس کو پورا کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ فتح مندی اور کامیابی کی دو منزلیں تم نے طے کر لیں۔

مگر پھر کیا تمہارا کام ختم ہو گیا؟ اس کے بعد کیا تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ قرآن کی عالمگیر صداقت بتاتی ہے کہ نہیں۔ بلکہ دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور بھی باقی ہیں۔ اپنی ہمت کو آزماؤ کہ ان کے لیے تمہارے تلوے تیار ہیں یا نہیں! تمہاری کمر ہمت مضبوط ہے یا نہیں! اگر نہیں ہے، تو ممکن ہے کہ یہ دونوں منزلیں تمہارے لیے سود مند نہ ہوں۔ وہ دو منزلیں یہ ہیں: قرآن مجید نے فرمایا کہ ایمان اور عمل صالح آدمی کے اندر پیدا ہوا کہ انسانیت کی جو ایک زنجیر ہے، اس کی ایک کڑی نے اپنے آپ کو درست کر لیا۔ لیکن کیا ایک کڑی کے درست کر لینے کے بعد زنجیر کا پورا کام ہو گیا۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔ تم کیا ہو؟ افراد کا مجموعہ بکھری ہوئی کڑیوں کا ڈھیر۔ اس بکھری ہوئی شکل میں بے کار ہو، اس میں تمہارا کوئی وجود نہیں۔ قران وجود مانتا ہے اجتماع کا۔ اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں، بلکہ زنجیر کا ہے۔ تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے۔ اس کا کام پورا نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی، زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس لیے فرمایا کہ کامیابی کا سفر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک تیسری منزل تمہارے سامنے نہ آئے۔ وہ تیسری منزل فصیح و بلیغ لفظوں میں: وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَوْ

بِالصَّبْرِ ۝ ہے یعنی تم جو ایک کڑی تھے، تم نے اسے ایمان کی مضبوطی سے استوار کیا لیکن تمہارا کام ختم نہیں ہوا۔ تمہارا فرض ہے کہ دوسری کڑیوں کو بھی درست کرو اور انہیں اس طرح درست کر سکتے ہو کہ جس سچائی کو تم نے اپنایا ہے، اسے دوسروں میں بھی پھیلاؤ جب تک تم میں یہ بات نہ ہوگی کہ تمہارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے۔ جب تک تم تواصی حق نہ کرو گے کامیابی تم کو نہیں مل سکتی۔

لیکن اگر اس تیسری منزل کے لیے تم تیار ہو گئے، اگر توفیق الٰہی نے تمہاری دست گیری کی، تو پھر آخری منزل کون ہے؟ وہ ہے جو صبر کی منزل کے لیے لازم و ملزوم ہے، اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا کہ حق کی وہ وصیت کریں گے، حق کا وہ پیغام سنائیں گے مگر حق کی دعوت پہنچائیں گے، حق کا یہ حال ہے کہ اس کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا، جب تک وہ قربانیوں کے لیے بھی نہ اٹھے۔ فرمایا کہ مومن صرف حق کا ہی پیام نہ پہنچائے، بلکہ صبر کا بھی پہنچائے۔

تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے حکم کو بدلا ہے، بلکہ اپنے طریق عمل سے شریعت کے لفظوں کو، بولیوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔ ''صبر'' کے معنی کیا ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں بے غیرتی اور باطل کی پرستش اور پوجا۔ تم صبر کے معنی یہ سمجھتے ہو، لیکن جو شخص صبر کے معنی یہ سمجھتا ہے، اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریف لفظی کرنے والا کوئی نہیں، تحریف معنوی تو بہت سے علما کر رہے ہیں۔ لیکن تحریف لفظی یہ ہے کہ اگر صبر کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے حق کے مقابلہ میں مصیبت آ جائے، تو تم کو چاہیے کہ صبر کے گوشے میں پناہ لو یعنی ہر طرح کی بے غیرتی کو، بے چارگی کو، باطل پرستی کو قبول کر لو۔ تو میرے بھائیو! تم سے بڑھ کر قرآن کی تعلیم کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

صبر کے معنی بالکل اس سے مختلف ہیں۔ ''صبر'' کے معنی ہیں ''برداشت'' کے صبر کے معنی ہیں جھیلنے کے، صبر کے معنی ہیں تحمل کے۔ جو قدم تم مقصد کی راہ میں اپنے محبوب و

پیارے مقصد کے لیے اٹھاؤ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں، طرح طرح کی ڈراؤنی صورتیں آئیں، زنجیریں اور ہتھکڑیاں آئیں، بلکہ ممکن ہے کہ تمہارے سامنے تختہ آوے اور اس پر ایک پھندا جھول رہا ہو۔ یہ سب تمہارے سامنے آسکتا ہے لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو، تو تمہارا فرض ہونا چاہیے کہ تمہارے اندر صبر ہو، تمہارے اندر برداشت کی وہ اٹل طاقت ہو، برداشت کا وہ پہاڑ موجود ہو، جس پر دنیا کی کوئی شوکت، کوئی تخت و تاج فتح یاب نہ ہوسکے۔ یہ معنی صبر کے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے مواقع استعمال پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر جگہ صبر کے یہی معنی ہیں۔

مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید نے جو صداقت نوع انسان کے آگے کامیابی کے لیے پیش کی ہے اور اب سے تیرہ سو برس پیشتر جو ایک اٹل اور لازوال پروگرام بنا دیا ہے، یہ اس کی چار دفعات ہیں۔ اگر وہ کوئی سفر ہے، تو یہ اس کی چار منزلیں ہیں۔ ہم کو ایک منٹ کے لیے غور کرنا چاہیے کہ کیا دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان مل سکتی ہے؟ کیا تم شک کا روگ اپنے پہلو میں لے کر دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پاسکتے ہو؟ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی بھر جو اور چاول بھی پاسکتے ہو، جب تک تمہارے اندر طلب کے لیے سچا جذبہ ہو؟ کیا ایک لمحہ کے لیے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمہیں دکھا سکتی ہے، جب تک تم حق کی راہ میں قربانی چڑھانے کے لیے تیار نہ ہو؟ خدا کی اس کائنات میں ایک ایک ذرے کے اندر اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا، جب تک وہ ایمان، حق اور صبر کی منزلوں سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون، ہر اڑنے والے پرندے کے لیے ہے۔ کیا خدا اپنا قانون تمہارے لیے بدل دے گا؟ کیا خدا تمہاری غفلتوں کا ساتھ دے گا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس دھوکے میں پڑے ہو، تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں ہے۔

حواشی

۱۔ ان تمام الفاظ سے شام کے قبائل مراد ہیں اور یہ تلمیح ہے کتاب خروج جلد ۳، صفحہ ۱۷ سے اس مضمون کی طرف جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے انعامات کا وعدہ کیا گیا تھا۔

۲۔ البلاغ ۲۶ نومبر ۱۹۱۵ میں لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا ترجمہ حسب ذیل ہے:
''ہم نے انسان کو ایک بہترین فطرت عادلہ و مقومہ کے قالب میں پیدا کیا ہے''

۳۔ ان کے پاس عقل ہے مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں، وہ (عقل و حواس کا استعمال کھو کر) چار پایوں کی طرح ہو گئے ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو سرتاسر غفلت میں ڈوب گئے۔

۴۔ یہاں فرمایا کہ قرآن کریم لیلۃ القدر میں اترا اور سورۂ بقر میں فرمایا کہ رمضان میں: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ۔(۲:۱۸۵) پس اس سے ثابت ہوا کہ لیلۃ القدر سے رمضان ہی کی رات مراد ہے۔
نزول قرآنی سے مقصود یہ ہے کہ نزول کا آغاز لیلۃ القدر اور رمضان المبارک میں ہوا ورنہ یہ ظاہر ہے کہ پورا قرآن نجماً نجماً ۲۳ برس میں نازل ہوا ہے۔
''قرآن'' اور ''الکتاب'' کا اطلاق جس طرح کل پر ہوتا ہے اسی طرح اس کے ایک جزو پر بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن کے ہر ٹکڑے کو اللہ نے قرآن اور الکتاب کہا ہے۔
لیکن بعض مفسرین کو خیال ہوا کہ ''اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷:۱)'' سے مقصود پورے قرآن کا نزول ہے۔ اس لیے انہوں نے طرح طرح کی تاویلیں کیں۔ مثلاً کہا گیا کہ قرآن کریم رمضان کی بیس راتوں میں جبرائیل علیہ السلام کو دیا گیا اور انہوں نے بیس سال کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ لیکن قاضی ابوبکر ابن عربی لکھتے ہیں:

ومن جهالة المفسرين انهم قالوا ان السفرة القتة الى جبريل فى عشرين ليلة والقاه جبريل الى محمد عليهما السلام فى عشرين سنة وهذا باطل ليس بين جبريل و بين الله واسطة و لا بين جبريل و محمد عليهما السلام واسطة

(احکام القرآن ج، ۲ ص، ۳۱۷)

اور مفسرین کی یہ جہالت ہے جو وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم بیس راتوں کے اندر خدا نے جبریل علیہ السلام کو دیا اور انہوں نے بیس سالوں کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ سو ایسا کہنا بالکل باطل ہے۔ نہ تو خدا اور جبرئیل میں کوئی واسطہ ہے اور نہ جبرئیل اور آنحضرت علیہما السلام میں کوئی واسطہ۔

قرآن حکیم کی تین سورتیں

ترجمہ و تفسیر

مولانا ابوالکلام آزاد

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

Mob. 0300-8834610 Tel .042-7232731

maktaba_jamal@email.com/maktabajamal@yahoo.co.uk